

(افسانے)

# ہائے اللہ

ہاجرہ مسرور

# ہائے اللہ

(افسانے)

ہاجرہ مسرور

کتے

”لے لے دھت.....“ دعوت بھی اور دھتکار بھی۔ بڑی عجیب حرکت ہے۔ ۱۹۴۴ء اور یہ حرکت کرتا ہے لٹو لٹوئی۔ اسے جہاں کوئی کتا دکان کی طرف منہ اٹھائے دیتا ہے۔ بس وہ پیٹھے پی پیٹھے کی طرف سرک سرک کر پوری طاقت سے دھتکارے ہوئے ہاں بتائی مضامین جو خاص اسی مقصد کے لیے الگ قلمی میں پڑی رات ہی ڈرا ڈرا اٹھا کر کتے کے سامنے پھینکے لگا ہے اور اس حرکت سے اس کی حالت کچھ عجیب سی ہو جاتی۔ انکی کہہ دیکھنے والے بغیر قصے نہ رو سکتے۔ لیکن بچنے والوں کا کیا؟ کبھی نہ بوجھیں۔ کبھی کمال دینے سے مطلب۔ کچھ زیادہ دماغ کڑا تو یہ کہ بچارے لٹو لٹو دماغ چل گیا ہے۔ جیسی تو مہیاں کتوں کو مضامیناں کھاتا ہے۔ ہونہ! کوئی اس کے دل سے پوچھے سڑک پر پڑے ہوئے کتوں کی اہمیت۔ دیکھنے میں تو وہ ہیں، بھوکے سر جھٹکے ہو ذرا دھتکارے سے کیس کیس کر کے ادھر ادھر تک کراہتی ابھری ہوئی پٹیلیوں کی دھوکھلیاں ذرا تیز کر دیتے ہیں۔ مگر ان کتوں کا مہم چلانے اور یوں دکھائی تو لٹو لٹو کسی خوفناک اقدام کا چال چلیم۔ معلوم ہوتا ہے۔

بات کچھ یوں تھی۔

شیر کے سب سے زیادہ عجیب لیکن اہم دو منزلہ بازار میں لٹو لٹو دکان اپنے سر پر اور آس پاس کئی بہت اونچی دکانیں رکھنے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ دن بھر تو خیر وہ ابھی طرح دکان لگاتی نہیں تھا۔ لیکن جیسے جیسے دھوپ (صلقی اور ہوائی منزلوں پر رکھی ہوئی دکانوں میں قسم قسم کی محروموں کو بچوں کے شو کھس میں دیکھتا تو اس کے بھاری ہر کم جسم میں انکی چٹائی جاتی کسمپٹ جھپٹ کر کولہری سے مضامینوں کے قلم کمال کمال کر جھٹل کے پڑے مڑے ہوئے لکڑی کے تختے پر کھائے لگے۔ چاندی کے دروازوں سے داخل ہوئی رنگ برنگی مضامیناں جن کو دیکھ کر منہ میں پانی بھرا آئے لیکن کہا کہ؟ دکان کے سامنے ہی لکڑی کی پرانی سیاہ تختی پر لکھا ہے۔ ”خالص تھی کی محمد مضامیناں۔“ شاید یہ اس وقت کی بات ہوگی جب اس تختی کے حروف دور سے چمکتے ہوں گے۔ اب تو اس کے حروف جیسے جیسے دھندلے پڑتے جاتے تھے ویسے خالص تھی کی محمد مضامیناں بھی خراب ہوتی جا رہی تھیں۔ آس پاس والے دیکھنے کس کس کی چوٹ پر اسی جگہ فٹ سے بتا جاتی تھی کے کنست پر کنست کھول کر بڑے کڑواؤں میں اوندھا دے جاتے۔ سڑے بے لڑیاں لگے میدے

کھٹنڈ کوئے اور سسے مال مسالے کی بنی ہوئی مٹائیاں حرے سے مل دی جاتیں لیکن دیکھنے والے چوں نہ کرتے۔ اور کرتے بھی تو کس منہ سے؟ یہاں تو کبھی مٹائیاں جیسے مال اپنا بھی پاتے۔ ہاں تو بازار سے ہی ملو کی دکان بھی کج جاتی۔ بے فکر سے کھان کی ٹولیوں کی ٹولیاں سلی سکری اور مل کھاتی ہوئی سوک پر پھیل کر اس طرح مزاحمت کرتے گتیں جیسے رات بھر تپے سے بند رہنے والی مریضیں کج کوچنے کے لیے کھڑ دی جائیں۔ اس وقت سے بس ملو کی دکان کے آگے ٹامسا ٹھٹھک سا لگ جاتا۔ بکری تو خیر دن میں بہت نہ ہوتی۔ گا کب آئے اس سے آنے والے کی چڑھری اور دکان کے تختے سے بھر کر دس پانچ منٹ کو کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ سامنے والی دکان کج کج بڑی ملو بھی تھی۔ اچھی اونٹنی کرا پیسے دینے لوگوں کی ہمت نہ دیتی اور ہانے کی لیکن بچے والے بھی مری اور دیکھتے۔ سنتے ہیں قصب کی لٹ بڑی اونٹنی ہے اچھے بٹے کے لوگ تو خیر اس باندی کا اندازہ بیٹھوں بیڑھاں لے کر لکھتے ہیں۔ جن کی تگوں میں انجام نہیں ہوتا وہ بچے ہی سے کھڑے کھڑے اس کی باندی دیکھنے کے لیے سزا خدا دیتے ہیں اور اٹھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ چاہے سرے ٹوٹی کیوں نہ کر جائے۔ گردن پیچھے سے کیوں نہ جاگے پر حسرت تو نہیں رہے گی دیکھنے کی؟ اور بھر پگی بات تو یہ ہے کہ اونٹنی پر نظروں کی چڑھائی کر لی۔ یہی بہت ہے۔ لیکن لو اس قسم کے گا کھوں سے کچھ چڑھایا کرتا۔ کوئی کہاں کا جاتا ہی کیا تھا بھلا؟ آنے والے کر کے روچوں کا حساب پڑ جاتا تھا۔ اسے۔ خیر وہ بات تو تھی ہی لیکن یہ دیکھ کر لو کے تن دن میں آٹھ ہونے لگتی کہ کم بخت کتے صرف اس کی مٹائیوں کے لٹائی میں اس کی دکان کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ سکتے کھلی کے مارے گھونڈنے سے کھٹنڈ اس کی مٹائیوں کے پھیلنے کی دیکھتا ہے۔ کچھ نہیں کہتی اور بھی ابا لال ملو کی دکان میں بڑاڑتے۔ بس یہی ہوئی مٹائیوں کو تکتے ہی رہتے اور ملو کا مارے بھٹھکا ہوا ہٹ کے رنگ بدلتے لگتا۔ کچھ بس نہ چلتا تو زور زور سے دھکارتے لگتا۔ "دھت دھت" کم بخت دیکھی کام کے نہ کج کتے۔ رات کی رکھوالی کی ہوا میں بازار میں رات ہی دن تھا۔ چوری پکاری کا امکاں نہیں۔ اور اگر گردن کی بات تو اگر بڑی رات ہے۔ کسی کی کیا بات ہے جو دکان کے قریب بھی پھلک جاتا۔ غراوہ اور دوسرے تمام دکانداروں بھر اٹھتے ہی کیوں نہ رہیں بھرا سے تاکہ وہی کیا تھا ان کوں سے؟ سوائے نقصان کے کیونکہ بعض سفید پوش دکان کے سامنے کوں کو دیکھ کر ذرا خوف ہی تو کھاتے۔ اور بھی ان سب باتوں کے علاوہ وہ تھا مٹائیوں کا کالک۔ اور مٹائیوں کی جتنی قیمت۔ کوئی سستی کوئی مہنگی۔ مگر ہر ایک کی کچھ نہ کچھ قیمت ضرور تھی۔ نہیں کہ کوئی آٹا اور مٹ حرا لے کر چلتا جا۔ لیکن دوسرے بھٹے اپنی مریں ہی بازار میں تھانے کے باوجود قیمت والی ہاتھ کھتے ہی نہ تھے۔ بس دکان کے سامنے ہی منہ لپا کرتے دھنسنے ہوئے بیٹھ دھوکی کی طرح پھرتے پھٹے۔ ساری جان سے کچپا کچپا کر زبان کی نوک سے لال کے تار باہر جا کرتے۔ اور تو تھا کہ آپ ہی آپ ملکتا۔ عاجز تھا

غریب۔ "ارے یہ کتے؟" دو دانت کھٹکی کر آپ ہی آپ بڑاڑنے لگا کر وہ کتے تو کتے.....

سورج غروب ہوتے ہی بازار کی روٹیں چنگی ہو جاتی۔ بجلی کی تیز روشنی میں مٹائیوں پر پھینکے ہوئے چاندی کے ورق اور مچھوں کے کھٹکس میں رکھے ہوئے چروں پر بٹا ہوا پاؤڈر کا ٹھہرا ہوا بھلا لگتا کہ بس۔ بازار میں گا کبھی بھٹے اپنے بڑے قسم قسم کے گا کب۔ مولوں پر اڑا کر آنے والے پیدل دیکھتے والے بھٹیوں میں ٹوٹوں کی گندیاں رکھنے والے اور مٹی میں چند پھندے یا کر کسی پگلی دکان پر خریداری کے بھانے کھڑے ہونے والے۔ سب کے پاس قیمت ضرور ہوتی۔ چاہے وہ اونٹنی دکان پر کھینچے کے لیے قلف کا کام دیتی ہو یا ایک پان اور ایک سگرت خرید کر کھٹوں اسی دکان پر اڑا دھانے کے لیے ہو مگر اس بازار کے گا کھوں کی ایک قسم اچھی۔ بڑیوں کے خبڑ جم پر تلے گئے ہوئے پٹے پھوٹی کڑی نہیں اور منہ اٹھانے دکانوں کے پھر کاٹ رہے ہیں جیسے کہ رہے ہوں ہم بھی ضرورت مند ہیں۔ بیوقوف کہیں کے ابھرتے بھرتے جھک جاتے تو پھر کسی پگلی دکان سے لگ کر مال کے گھونٹ کے گھونٹ ملنے سے اترتے اور اکھڑا ہوا ہوتا کہ ملو کی دکان کو اڑا کر اپنا کالک اپنا پانی جاتیں۔ اس پر ملو کوں کوں کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں پر بھی قصہ آنے لگتا۔

"شرم نہیں آتی۔ چلے ہیں خالی جیب مشق کرائے دی مشق کر جسم پر نہیں ڈا پان کھا میں البتہ۔ آخر یہ دکان سہا کر بیٹھنے والی عورتیں۔ بیٹھتے عالم ان کا گا کب ہے۔ بیٹھتے جم بیٹھا ہے۔ جب کہیں غوک پڑتا ہے۔" اور بھرا سے اونٹنے دکانداروں پر دم اڑتے لگتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوں کوں کوں دیکھ کر اپنے اوپر آتا ہے۔

اکھڑا توں بھی سرشت رکھنے والے کوں کی طرح نہیں کہیں توں ہاں دانت کھٹکی کر ایک دوسرے سے کہنے لگتے۔ "دیکھو رازا ہروالی کو۔" وہ اور وروالی کی طرف تو چڑھتے ہوئے کوئی سوئی کی گالی ضرور کہتے اور جیسے وہ گالی یہی ملو کے پیچھے میں رہ بھی نہ کر اتر جاتی۔ وہ اپنی مٹائیوں پر نظر مٹا کر ان کی طرف لگا دیتا اور اصر سے پڑتیں گالیاں اور بیٹھنے والیوں کو۔ ایسی ہے ویسی ہے کھٹنڈ ہے کھٹکی ہے کھٹکی ہے۔ اور ملو اپنے پیچھے پر ہاتھ رکھ کر چپتا۔ "بھگور کھٹے ہیں۔" ان مٹائیوں کو تکتے والے کوں کی سوں سوں اور کہیں کہیں کا کچھ ملہم لگا ہوا ہے تو یقیناً یہی ہوگا۔ تاکہ مٹائیوں دراصل ویسی نہیں ہوتیں جیسی کہ دکان دیتی ہیں۔ پھر بھی ان کے بانے میں کچھ ڈا گت آتی ہی ہے۔ ڈا گت بہت اچھا نہ کسی گروت پر اٹھیں کھا کر بھوک کی شدت تو کسی قدم کو ہوتی تھی۔ بس دونوں قسم کی دکانوں کا یہی حال تھا۔ دوسرے سے یہ بازار ہی نہ ہوتا اور نہ یہ کتے۔

"ڈرا بھی سیر بھر گلاب جاتیں تو دینا" کوئی بڑے ہی فوجین حرا لے گئے بندھے گا کب سینہ تانے دکان پر آن کھینچے اور ملو کو ایا

محسوس ہوتا جیسے اس کی آہ نے اس کے خیالات کی تانیہ کر دی ہو۔ لڑکیاں گلے مینے کھٹے ہوئے اور باجی سچی سے پکٹی ہوئی گلاب جاسمین تول کر دھو رہی تھیں۔ پھول جاتا اور دھوئیں گلاب کی جیب نکلتا۔ "غراب گلاب جاسمین لے کسی نہ کسی زینے پر دھنا۔" کسی روئی لیکن کسی کھائی دکان پر کھٹی جاتے۔ بھرلو کھانا دھان سے چلا اٹتا۔

"دھت دھت..... سالے..... کتے۔" کتے دم دبا کر گردن جھکا کر چپکے سے سرک جاتے اور آپس جھمی کوڑی نہ رکھنے والے بڑی کھپائی فنی بیٹے ہوئے کسی کالی شویس پر لچائی نظر میں ڈال کر اصرار ہو جاتے۔ اب لٹوکا آپ سی آبی آبی آتی تھی۔ سارے جسم میں ڈال کر سا آ جاتا اور دوڑے پیار سے اپنی چھپائی ہوئی مٹائیں کے ننھے ننھے ٹیلوں کو دیکھ کر سوچنے لگتا۔ بھلا اس سے فائدہ ہی کیا؟ چاہے بوجھنے اڑے رہتے ہیں کم بخت۔ بچوں کی جگہ میں آ جاتی نہیں کہ یہاں قیمت سب کچھ ہے ضرورت کچھ نہیں۔ یہاں سٹیکلوز ایسے ہیں جو آئے دن بیرون مٹائیاں ٹھونسنے رہتے ہیں۔ بھر چاہے پڑھیں ہی کیوں نہ ہو جاتے۔ اوتھے ہی کیوں نہ بھریں۔ ہر جگہ گند کی ہی کیوں نہ پھینگیں۔ لیکن کسی کو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ قیمت ادا کرتے ہیں۔ اور ایک ہی ہیں۔ کھنگ۔ کوئی کیوں مفت ان کی ضرورت کالافاکرنا بھڑے؟ چاہے انہیں عمر بھر مٹائیوں کے لیے ترسنا اور بگٹنا ہی کیوں نہ پڑے۔ قیمت نہیں تو کچھ نہیں۔ اور لٹو یہ سب سوچ کر طبعیت کا خدا رہن جاتا۔ اسے زور دہر بھر بھی کتوں سے بھڑکی نہ ہوتی۔ ٹھوڑا گھاس سے رشوبھت جڑے تو بچا اور کھائے کیا؟

لیکن ایک دن.....

بازار سب معمول ایک بڑی سی گلی کی پہلی کی طرح اپنی جگہ پر تھا۔ کب کبھیوں اور بھیتوں کی طرح اس پر چڑھائی کے ہوئے تھے اور فلو اس دن کتوں کو چھڑی دکھا دکھا کر عرب کا ٹھہرا تھا کہ اسے میں اس نے اپنے سامنے کی اونچی دکان پر چند ہولناک چھینٹیں ٹپکیں۔ وہ اپنی گود میں پڑی ہوئی تو بچا چھال کر حیرت سے کھڑا ہو گیا اور سڑک پر تو جیسے غدار پڑ گیا۔ جسے دیکھو یہ تھا شامی زینے پر چڑھا ہوا ہے۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ جواب میں اس اونچی دکان کی ایک دکان کھجے پر آ کر بیٹہ کھٹے ہوئے چلائے تھی۔

"ہائے مار ڈالا..... زہرہ کے چھری جھونک دی۔ ہائے ہائے۔"

اور پچھلے دنوں میں سے کسی نے ازراہ بھڑکی زہرہ کی بہن کو کسر سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ جی کہ جیسے چلا چلا کر جان دے ڈالے تھی۔ لٹوکا دل چاہا کہ وہاں ہا کر پوری کیفیت معلوم کرے اور کچھ نہیں تو زہرہ کی بہن سلطانہ کو ٹوٹی دیے آئے۔ سچااری کہی ہے حال ہوئی جاری تھی۔ لیکن دکان کس پر چھڑے؟ اسی خیال سے وہ سبکی مار کر اپنی جگہ پر بٹھا رہا۔

ازراہ زہرہ بخون میاںات پت زہرہ ہاتھوں ہاتھ سڑک پر اتاری گئی اور اس کے پیچھے ایک سریل ساؤشی آدی بگٹی کھٹے کی مضبوط جھانوں نے دیوچ کھاتھا۔ کھلی کی تیز روشنی میں زہرہ کے سینے سے ابلتا ہوا بخون اور اس آدی کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں کہ لٹوکا جسم مارے غوف کے سرد پڑ گیا۔ اسے یاد پڑا کہ اس سریل سے آدی کو اس نے سٹیکلوز دھوا اپنی دکان سے گئے دیکھا تھا جو کہ جیب میں کوڑی نہ رکھنے والے لگا ہوں گے کہ وہ میں سے تھا۔ سلطانہ دور در کبہ رہی تھی۔

"ارے یہ آ پنا زہرہ ہاتھی سے یاد ہے کوڑی کے چھیز کرنے لگا۔ جس پر زہرہ ہاتھی اسے کھٹے سے نکالنے لگیں۔ بس اس نے کچھ کہا نہ صاحبٹ چھری کھال کر ماری۔ ہے بے امیری بہن بچااری؟"

زہرہ غوٹکی آ آتھی سے کہہ رہی تھی اور وہ سریل سا آدی آنکھیں چھڑے کر ٹیل جھانوں کی ہاتھوں میں پکڑا اور اپنی اوپلی سائیس لہر ہاتھ۔ مجمع میں چمک چمکاپاں ہو رہی تھیں اور اس سرے سے اس سرے تک پہنچنے والے تاجر بے ہوئے تھے۔ تھوڑی سی دیر بعد زہرہ کو ہسپتال اور اس سریل آدی کو پولیس چوکی لے جایا گیا۔ مجمع چھٹا تو بازار میں جیسے الو بول گیا۔ ہر شخص چپ۔ لٹوکا جیسا بیٹھا تھا دیباہی بیٹھا رہ گیا۔ شاں نے کسی سے کچھ نہ بھڑا اور کسی سے بھڑکی کیا بالکل گم سم۔ "یہ کھٹے بھوکے آدی اور یہ بھتے" وہ سوچ سوچ کر حیرت میں غرق ہوا چار ہاتھ کرناٹے میں چند کتے بھڑاں کی دکان کے سامنے سڑک پر بیٹھ ہو گئے۔ مر جھٹے بھوکے دھٹے ہوئے فٹوں والے کتے۔ اور جیسے لٹوکا دماغ جھٹکے گا کہ اسے اس سبکی معلوم ہو کہ اب ان کتوں نے دکان پر جھست کی اور اب اسے چاہا اس کے خون کو لال لال کھروڑی زہرہ ہاتھوں سے چاٹا۔ روشنی میں بہت سی چھتی ہوئی کھٹی آنکھیں۔

"دھت دھت" وہ کھڑا آواز میں چلا گیا۔ لیکن کتے نہ سرے۔ یہ کوئی غلاف معمول بات نہ تھی لیکن آج کتوں کی ہٹ اسے بڑی ہی خطرناک معلوم ہوئی اور اس نے ڈر کر کچھ دہی چلی پھیں سڑک پر پیچیدہ دیں۔ بھوکے ہیں نہ چاہے کیا کر نہیں؟

اس دن سے آج تک.....

"دھت دھت" لے لے لے "دھت" وہ کتوں کو دکان کے سامنے بیٹھ کر غوف سے چلا تا اور بھر جانے کیا کچھ سوچ کر بگٹی بگٹی مٹائیاں ان کے آگے پیچیدہ دیتا۔

"کوئی ایسی صورت ہو جائے کہ لٹوکا میں سرے سے کتے نہ دیکھ سکے کیا بھڑا ہوا؟"





جائیں لیکن کبھی بھانے چنے موڑ لی اور نھی کی طرف تو آ کر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ بس اپنا جھٹ اور صبح..... باقی سب سے گویا نہیں نظر ہو گئی تھی۔ لیکن بھی نھی دواہی کی خوشنودی حاصل کرنے پر تکی ہو گئی تھی۔ ایک صبح کے لیے بھی سامنے سے نہ گئی۔ آخر وہ پہر ڈھلے ان کا منہ بھی اٹھا۔ اشارے سے نھی کو اپنے پاس بلا دیا۔ نھی خوش خوش ان کے قریب جا بیٹھی۔

”وہ کچھ نھی ادا کرتا میرا کہنا نہ اے گی تو میں حیرت مند دیکھوں گی۔“

”دواہی! میں تو تمہاری ہر بات مانگتی ہوں۔“

”تو صلو کے پاس نہ بیٹھا اٹھا کر اور نہ اس سے بات ہی کیا کر۔“

”کیوں؟“ نھی اس نئے حکم سے چنگی۔ کیونکہ ہر میں صلو ہی اس کے سب سے زیادہ طرفدار تھے۔

”بیانی تو کیا ان لڑکوں سے الگ رہتی ہیں۔“ دواہی نے گویا ایک بڑا انداز کہہ ڈالا۔

”تو میں بیانی ہو گئی ہوں؟“ نھی واقعی اس وقت بہت حیرت سے اپنے متعلق فیصلہ سنا چاہتی تھی۔

”بہت۔“ دواہی اس وقت اعتراض کرتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ کہیں یہ یہ خوف لڑکی یہ بھی نہ بچ چکے کہ سامنے ہونے کا مطلب

کیا ہے۔ انہیں فوراً ہی اپنا تکیچن یاد آ گیا جب وہ اپنی اماں کے اشارے سے سب کچھ چھو گیا کرتی تھیں۔ اور تو اور سات برس کی عمر

سے اسے ڈھنگ سے دہرا دہرا سنی تھی کہ گھر میں آنے جانے والیاں شادی کے پیام لانے کی فکر کرنے لگی تھیں اور ایک یہ ہے تھا۔

دواہی کی خاموشی سے نھی کے دماغ میں ایک ایسا سوال اٹھا یا جس کے خیال سے دواہی کو چٹ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

”تو میرا آنا؟ صلو ہی کے ساتھ کیوں نکلتی ہیں؟ انہیں کیوں نہیں روکتیں؟ بس میرے ہی پیچھے پڑی رہتی ہو۔“ مارے جوش

کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”چلیں! وہ بڑے سے بڑے کام سے اس کے سر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے کہیں۔“ وہ بھینکے اودان کی تکی بہن ہیں۔“

”اور میں؟“

”تو چلا جا اور کہن ہے۔“

”جب تو ہم دونوں بیٹھیں ہی ہیں ان کی۔“ نھی کو چلا جا اور کہن تو انکی بہن میں کھنڈر یا فرق نہ معلوم ہوا۔

”اری وکیل کی بیٹی اچھے دلکیشان جھانڈا بہت آتی ہیں۔ بس میں نے کہہ دیا آ منکا جہول چاہے کہ مرقہ نہ کر۔ اے کوئی کچھ

نہ کہے گا لیکن تجھے سب تو کہیں گے۔“

رکھا نھی کلائے دوڑی اور کچھ کئی دھما چڑکڑی۔ کسی نے جھانک دی کسی نے پکار۔ اے لوادو کھنڈ موڑ اور دھک کے قریب پہنچا۔ نھی انہیں پکارنے کے لیے بھٹی ہی تھی کہ کسی نے اس کی چوٹی پکار کر گھسیٹا۔ اس نے جھڑک کر چوٹی پکارنے والے کو دیکھا تو دواہی سر پر سوار تھیں۔ غریب کے چلے چھوٹ گئے۔

”ہائے اٹھ! اس کسکی بڑوگی کا کیا کروں؟“ دواہی نے تر سے اس کے منہ پر چاٹا سرید کیا اور وہ پکار کر زمین پر پڑھ گئی۔ آنکھوں کے سامنے جیسے چراغ کی کوئی ابھری اور پھر اندھیرا چھا گیا۔

”ارے کیا بات ہے دواہی؟“ صلو ہی نے دوڑ کر دواہی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چاتو رہنے دے! آ گیا دواہی کا سکا۔“ دواہی کی جالے سے منہ لٹی ہوئی آنکھیں چاندنی میں بڑی بھیاک معلوم ہو رہی تھیں۔

”بہت آؤ صلو! نھی انہی کی سب کوئی ہے تمہاری تو کچھ نہیں لگتی۔“ بڑی اماں کو دواہی سے لڑنے کا موقع ہاتھ آ گیا وہ دو پیسے دواہی سے غار کھائی تھیں۔

”وہ آؤ خیر بھی کوئی بات ہے کہ انہیں اور دھوں دھوں پیسہ دیا۔“ صلو ہی کو دواہی جی جی جی کہ دواہی کو چاک پکے یہ کیا سوچیں اور ادھر نھی کا غصہ دل اس ہر وقت باز پرس سے کھل اٹھا۔ کوئی تو ہے آؤ سے وقت کا ساچی۔ لیکن دواہی یہ سن کر ایک دم پھر گئیں۔

”تو مجھ سے بچنے والا کون ہوتا ہے۔ دیکھ آئے تو اسے اپنے آپ کو لپیٹ کر لوں گی۔ ہائے اندھا کی شان ہے کہ مجھے تھی یہ بھی

اختیار نہ رہے۔ جی بڑی لڑکی اور اس پر اچھل چھا کرے۔ اس پر اگر میں منع کروں تو اپنی ماں کا کالا ڈر بھاتی ہے جو چنے دوڑے۔ سب

فل کر لوٹ یا کوٹراب کرنے پر تے ہوئے ہیں۔“

بڑی اماں تو ہماری بیٹی تھیں۔ نھی کو ٹراب کرنے کا عین الزام جو نہ تو جھک گئیں۔ بات میں بات بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ

دواہی نے ہار کر نھی کی کندھی تان لی تو اپنی خود کو بھی پیسہ لیا۔

رات تجھے نھی کی اپنے کھنڈے پر اوندھی بڑی سیساں بھر بھر کر کہیں سوچ رہی کہ آ خرواد کو خاص کر اسی سے ملن کیوں ہو

گئی ہے۔ پہلے بھی تو آ خرواد بھی نھی تھی جو کہ رادیر بھی چپ خنٹی تو دواہی دیکھ لیں کہ کھینے جانے کو کہا کرتی تھیں۔ اور اب یہ

عالم کہ جہاں دواہی کے کوہے سے کولہا ہزار کہ نہ تھی۔ ان کے کلیجے میں ہو کہیں اٹھنے لگیں۔ جانے دواہی کو اب اس سے نفرت کیوں ہو

گئی ہے۔

صبح اٹھ کر نھی نے جود دیکھا تو دواہی کا منہ بری طرح پھولا ہوا تھا۔ سامنے جاشو آ یا تو دواہی نے منہ پھیر لیا۔ بیٹے نے سلام کیا تو

"اچھی دادی! بھلا کیوں تمہیں کے گھٹے؟" ننھی کی رنگ قمیس پھڑکی۔

"میں مردار چڑیل! دادی نے اس کے بازو تو زسواات سے بھرا کر ایک دو چتر سپرد کر دیا۔ اور ننھی نے کھائے روہنے کے ان کے گلے میں پائیس ڈال دیں۔

"اچھا! اب میں صلو بھیا کے پاس منتقلوں گی مگر اب تم مجھ سے غائب نہ ہونا۔"

اس وقت تو صلو بھیا سے نکلے گاٹ ساٹنے کی خوشی کے باعث مانہ پڑ گیا۔ ایک عجیب سی خوشی کہ وہ سانی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے دماغ پر ایک "مطمعہ" سہا ہو چکی تھا۔ جس کے نیچے ہینکلر سوواات سے مزے پھل کے مکروہ کیڑوں کی طرح کھانا رہے۔

دو تین روز تک تو سانیے ہونے کا نشا اسے سب کچھ بھلائے رہا۔ لیکن پھر غنائی کی ترشی نے اسے نکلے پکا کر دیا۔ جب صلو بھیا اس کے سامنے آئے تھے تواس کا دل جھل جاتا کہ وہ ان سے بولنے لگتا کہ اسے اور ان سے یہ سچی کہو ہے کہ "مجھے صلو بھیا! دادی کہتی ہیں کہ تم سانی ہو رہی ہو۔ اس لیے صلو سے نہ بولا کرو۔ ورنہ میرا دل تو بہت چاہتا ہے تم سے ہلاوں۔"

لیکن صلو بھیا بھی کچھ ناراض تھے ننھی کی گمان آکر انے ناظر اس کی طرف دیکھے ٹھان سے گزر رہا تھے۔ جیسے اب انہیں اس کی کوئی پروا نہ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ننھی کا دل بہت جھٹکا۔ لیکن وہ وہ!

ایک دن بڑے سوریے سے ننھی کی آنکھ کھل گئی۔ دادی کمرے کے اندر اپنے تخت پر نماز ادا کر رہی تھیں۔ باقی سب لٹی تانے تھے! چاکا جب اس کے دل میں آئی کہ اس وقت صلو بھیا کو چاکا کہو سب کہو ہے جس کو کن کہو اسے بے قصور سمجھیں۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر ننگے پاؤں اٹھ کر ان کے چنگ تک گئی اور اس نے ان کے چہرے پر سے چادر اٹھائی۔ ننھی چوری سے انہیں دیکھا تو وہ اسے بہت ہی بکھے مطمئن ہوئے۔ اس نے اسے ڈال دیا کہ وہ اس کے منہ پر دھنکی روئیں اور ان پر بیٹھنے کی ننھی بھی غصہ نہیں۔ اسے پیٹنے سے بڑی گھبراہٹ ہوئی تھی۔ غلو اس کے گلے کی کسی دوسرے کے۔ اس نے جھٹ اپنے نیلے دوپٹے سے ان کا پیڑ خشک کرنا شروع کر دیا۔ وہ جاگ پڑے اور ننھی کو اسے سوریے سے اپنے پاس دیکھ کر جھٹان دے گئے۔ انہوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پا کھ اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر چادر سے لٹکانا چھپا کر کراٹ بول دی۔ ننھی نے سوز کر کے اس کی طرف دیکھا دادی سلام پھیر رہی تھیں۔ اس کی کچھ میں فوراً آ گیا کہ صلو بھیا نے منہ کیوں چھپایا۔ وہ جھٹ کر اپنے کھلوے پر لیٹ گئی۔ دل اس چوری کی حرکت پر حوڑ حوڑ کر اٹھا۔ تو چاہے وہی صلو بھیا تو تھے جن کے ساتھ گھٹنوں بٹھا کمرے میں بیٹھ کر ان کی کیا کیاں تکی تھیں۔ جن کے کندھوں پر چڑھ کر بازو اس میں

کھوی تھی لیکن آج دادی کی ہائے نے اس کی مصمم حرکتوں کو کھٹا تلخیہ دینا دیا تھا۔

"ہائے اللہ!" دادی شوق کی کھٹا کھٹ کے ساتھ چلا تھیں۔ "ہر وقت پڑی ہے سنوڑی ابری تھجے کوئی کاٹھنیں کرتے کو۔"

ادھر کچھ گھنوں سے پائی آفت اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ دادی اسے غامض لٹھا بیٹھا بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

"کیا کریں پھر؟" وہ دادی کا ہر روز گرگٹ کی طرح بڑا ہوا رنگ دیکھ کر بہت زرد اور مضمحل ہو جاتی تھی۔

"ابری میرے پیٹے ہوئے گرتوں میں کھنوں ہی مبرارے۔" دادی اس پر احساس جو انی کا پورا پورا کر سکی کھنچی تھی کہ کھالی پڑے رہنے سے شیطان پاس آتا ہے اس لیے کھنوں ہی اسی میں ہے کہ پڑے پڑے زبانی پورا پورا دوتا کہ وہ بیان دے رہی تھیں لیکن بچاوی دادی کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ پڑا دوتا مگر کو ہے جس کر رہتی ہے اور پھر وہی مارا ایک معمولی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی حال ننھی کا ہوا۔ ہر وقت کی "ہائے اللہ" ننھے رہتا اس کی عادت ہو کر رہ گئی۔ پہلے تو وہ اپنے وعدے کا کالاف کرتے ہوئے صلو بھیا کو بچی بچی نظروں سے دیکھنے پر آمادہ کر لیتی تھی۔ لیکن اب دادی کی جرحی ہوئی ہے اس حد تک ہے کہ اسے ضدی بنا دیا اور وہ دادی کے کونے سے کھپا ہوا کر صلو بھیا اور رہا شو گھوڑے لگی۔ وہ کھانے پینے اور پیسے مانگنے کے بھانے بہروں دادی سے اب بھی۔ انہیں چپکے چپکے کوئی اور دل ہی دل میں ان کی گالیاں دہرائی۔ اسے اب دادی سے سخت نفرت اور ضد ہو گئی تھی۔ اس پر آ مترا پا کا بھانے میں مکمل کر دیتا اور بھی پتنگا بچوں پر لٹا دیتا تھا۔

ادھر ایک ماہ تو دادی نے اسے آ مترا پڑے ہوئے چائے کو بھی منع کر دیا تھا۔ کیونکہ آ مترا پانے ایک دن مجلس دادی کو کھلانے کے لیے ساری کو سمیت کرگھٹ کی طرح کسا اور اپنی سوئی سوئی رامیں غریب تو تھا نہیں بالکل پہلو انوں کی طرح۔ بڑی ماں تو مسکرا کر چپ ہو گئیں لیکن دادی نے جو یہ رنگ دیکھا تو خدا یاد آ گیا۔ ان کے خیال سے آ مترا پڑا ہوا سے نکل چکی تھیں اور ان کی لڑائی کے ساتھ وہ ننھی کو کیسے دیکھ سکتی تھیں؟ اب ننھی جی دادی کا سوا کھراٹا سا تھا۔

ننھی کی کچھ میں یہ سب بھی نہ آ تھا کہ وہ سانی کی ٹکڑ ہو گئی ہے؟ اس کی ہم عمر لڑکیاں تو ابھی تک لڑکوں کے ساتھ کتب میں چرچتی تھیں۔ وہ تو کھائے پڑھنے سے دلچسپی ہی نہ تھی۔ اور شاہی تک کتب میں چرچتی ہوئی۔ لیکن اس مصمم بچی کو کیا مطمئن تھا کہ دادی ان لوگوں میں سے تھیں جو ہر پتا کر کو ہر المک کچھ کہانے ہو کر کرتے ہیں لیکن جب واقعی وہ پتا راجاں ہو کر مگر جاتا ہے تو ان کی آنکھیں رنگستان کی طرح خشک ہو جاتی ہیں۔

گرمی کی دو پہر! ہر طرف سناٹا غامضی۔ اتفاق کی بات کہ دادی معاذی شوق سے سوری تھیں اور ننھی اپنے کھلوے پر بیٹھیں میں

شراب پر پی پالے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ دواوی کی روک ٹوک نے اس کے مصمم احساسات کو نکسر عجیبہ اور تجسس آمیز بنا دیا تھا۔ اس کے دماغ میں جبکہ وقت سینکڑوں سوالات کھلنے کی پھانسیوں کی مانند چورہ پے تھے اور جن کے جوابات وہ کسی نہ کسی سے مانگ کر اس غلطی سے نہات پاتی تھی۔ آخر اسے صلو بیبا سے بات چیت کرنے کو کیوں منع کیا گیا ہے؟ اس ایک سوال کے گرد اس کے کل احساسات گھوم رہے تھے۔

اس نے ایک بار بھر دواوی کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی۔ چلو صلو بیبا سے ہی پوچھیں۔ وہ بڑے اچھے تھا۔ وہ اس کی باتوں پر نہیں کہنے لگی۔ آہستہ آہستہ باتوں کی فضا خراب ہو گئی۔ وہ یہی سوچ کر اپنے کھلنے سے بھی اور نکلنے پاؤں آگہن میں نکل آئی۔ چانک احمد جیسے سے دھوپ میں آنے کے باعث اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور توستے ہوئی زمین پر جھپٹنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ اور بھی اڑیوں کے بل چلتی ہوئی صلو بیبا کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ہولے سے بھڑے ہوئے کواڑ کھولے اور اندر داخل ہو گئی۔

صلو بیبا سو رہے تھے۔ وہی بکھرے بکھرے ہال اور پیسے میں بیکل ہوئی سیس۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ان کے چنگ کی پٹی پر ٹک گئی۔ اسے دونوں بعد چوری چھپے ان کے پاس آ کر اس کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ اسے ان کی وہ تمام بھردریاں یاد آ گئیں اور بھر دواوی کے اشتہار کی انتظامیہ اس کا دل بھرا آیا اور اس نے اپنا سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ چاتی تھی کہ اس نے صلو بیبا بھردری کر لی۔

صلو بیبا جاگ پڑے۔ وہ بھی کوئی روک ٹوک کے باوجود اپنے سینے پر جھکا دیکھ کر اسے غصی سی غصی نہ تھی بلکہ ایک محرت .... جو کسی کی انگلی اپنے سینے کی طرف بڑھتے دیکھ کر جسم جڑتی ہے۔ جو کسی کو نیچے پٹیاں گھروں سے دیکھتی ہے۔ جو تنہائی کسی کی مسوں کا پسینہ پھینچنے سے بھی نہیں چوکتی اور جو دھیرے سے تانے میں جھنڈا ہٹے سے غلط ہو کسی کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرتی ہے۔ صلو بیبا کی عقل پر دواوی کے قتل از وقت احمد بیباؤں نے پروہ ڈال دیا۔

"ہائے اللہ" دواوی نے صلو بیبا کے کمرے میں ہاتھ پوتے ہوئے قدم رکھا اور جوبی اپنی چندھیا لی آنکھیں کمرے کی نم آلود تاریکی میں کھولیں تو ہائے اللہ کا زوردار فرمان کے پونچے میں سر پلا پلا کر رو گیا۔

زمین سے بہت اونچائی پر ہوا میں تیرتی ہوئی کسی چٹیل نے چلی کر دواوی کو آنکھیں کھلی کر لامل پڑھنے کی یاد دلا دی۔



## بندر کا گھاؤ

دو آدھے میں جھلنگی کھاٹ پر بیٹھ لیکن کی طرح ٹھکری بیٹی چلی تھی۔ گرمی کی بھری دو پہر اس پر ٹھہرا ہوا بخار۔ بی بیلا یا جا رہا تھا۔ کمرے میں گھر کے سب افراد اور دوا سے بندھنے کے آرام سے شش بول رہے تھے۔ کئی بار اس کا بیجا پکارا اور بھی سورج کی تپش سے بناو لینے کے لیے کمرے میں جا پڑے۔ لیکن اس کو ڈر تھا کہ کہیں اسے دیکھتے ہی کڑی نصیحتوں کی بجائیں مذکمل جائیں۔ اس لیے وہ سورج کی تپش اور بخار کی حالت میں بھی اس تھوڑی سی تنہائی کو ختمیت سمجھ رہی تھی۔ تیز دھوپ اور تیز بخار۔ اسے درہہ کرایا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی پڑیوں کا گودا گھٹل گیا ہے اور اس میں اس کی تسلی جی جا رہی ہے اور اس کی کانوں کی طرح ابھری ہوئی پٹیلیوں کو ایک مشہور ہاتھ جھانڈ کی سینکوں کی طرح توڑ مڑ دنا چاہتا ہے۔ اس عجیب احساس سے اسے کھانسی آنے لگی۔ وہی کھانسی اس طرح جیسے کوئی کڑی کے گھنے ہوئے خالی صندوق کو دھوپ ہو جائے اٹھانے کھانے اس کے مطلق سے کوئی چیز اونٹ آئی اور اس نے اپنے اپنے کھاٹ کے ڈھیلے بالوں کو سر کا رکھ دیا۔ تھے ہوئے خون کا ایک چھوٹا سا قطرچا پت سے زمین پر چپک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ خون کو دیکھ کر کچھ سوچتی بندوں کے خوشنمائی کی آواز سن کر بے حس و حرکت پڑ گئی۔ کچھ اسے بندروں سے بہت خوف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بغیر گردن موڑے آنکھیں کھلا کر اس طرف دیکھا دھڑے آواز آ رہی تھی۔

ہائے اللہ ..... اس کے چن چناتے ہوئے ہونٹوں کو اور بھی جھٹکنا ہوا لگا آؤ! کتنے بہت سے بندر بار بیٹھے اس کی پیٹھ کے پیادہ جھگڑا سے دلی غم سے دھچکا دھچکا پست پرانی سی جی پھلگھیں لگا رہے تھے۔ اس کا دل ایک دم پاپا کا وہ جھاک کر کمرے میں گھس جائے۔ لیکن اس ڈر کے مارے وہ حرکت نہ کر سکی کہ کہیں یہ سب بندر اس پر ٹوٹ نہ پڑیں۔

کاٹنی سے کالی منڈ پر پراچک مر جھٹا سا بندر پڑا سسک رہا تھا اور اس کے ارد گرد کی مونے موئے بندر بیٹھے اس کی پیٹھ کے پیادہ گھٹاؤں گھٹاؤں کو اپنے تیز تھنوں سے کچر رہے تھے۔ بندر کا مہرہ گھٹاؤں کچر کر اسے بکھرے یاں آنے لگیں اور بندر تھے کہ ڈم کے مساتے میں پوری طرح شہک اٹھی ایک گھاؤ میں ہاتھ گھسول رہا ہے کہ دوسرا کھسک لگاؤں بنے بیٹنا دوسری عمل شروع کر دیتا۔ گو یا ایک ڈھی اور سینکڑوں جراح۔ اور وہ چارہ مر جھٹا بندر تھا کہ مارے تکلیف کے سر ڈھالکے دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب مرا



اب سرا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کم بخت یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتا؟ بھلا اس طرح اپنے گناہ کا معاوضہ کراتے کراتے جان دینے سے حاصل کیا لیکن ہے محض جانور! پھر بھی اس سے اس عظیم ہند کی بکسی پر بڑا ہزار ہا تھا۔ اس کا ہی چاہا کہ وہ کسی طرح ان دھوں کے دھوں بندروں سے اس کا چھپا چھڑا اورے جو بندوں کے یہاں کے تھوڑے بھر سے ہیں لیکن..... لیکن کیاغت اس کی کڑواہٹوں پر کوئی مضبوط ہاتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ کٹائی اور پٹنے سے لے کر قتل تک گھر گدی۔ اس کا سہ اس طرح بھر کر بھیجے اس نے بیک وقت پان کی کٹی گھڑیوں کی بیک اسٹری کر لی ہو اس نے گھر آکر تھکا۔ عی ای دی..... سرخ سرخ جیتا ہوا خون ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اپنے بدن پر کھنکھاسا اور ہاتھوں بھری گھاٹ پر گر پڑا۔

بندو بخیر ہے تھے اور کمرے میں گھر کے لوگ اس کے یوں الگ حلقہ رہنے پر راضی نہ رہے تھے۔ اس نے بیڑ اور بوکریاں ڈھلی ڈھلی چائیں پیا کر پینی سے اڑائیں اور دونوں ہاتھ پٹنے پر رکھ لیے۔ اس کے کانوں میں گھردلوں کے بڑبڑانے اور بندروں کے غوغائیے کی آوازیں آ رہی تھیں کہ گرم سلاطین کی مانند اترتی معلوم ہو رہی تھی۔ بندو گھر والے کتنے ہم آہنگ ہیں۔ اسے خیال آیا اور اسے اپنے سارے جسم میں ہنسون کی چوڑک محسوس ہونے لگی۔ معافیہ اس سے کسی نے کہہ دیا کہ تو بھی اس سرخیلے بندر کی طرح ہے جو جانتے بوجھے مہلک تاراج کا شکار ہو رہی ہے اور پھر بطور دلیل اس کے دھتکے ہوئے دماغ پر کچھ زمانہ قیل کی کئی اہم صورتیں لکھا ہوا تھا۔

”نہیں چوتھیں برس کی جوان بھگتی آکھوں میں نہیں ملتی اب تو۔“ ہاں کچھ مل کر فکر مند لچے میں کبھی ملتی اور اسے اپنے پہاڑ جیسے کنارے کا بہت احساس ہونے لگا۔ اس کے خاندان کی ہم عمر لڑکیاں بلکہ اس سے بھی کم عمر لڑکیاں کتنے ہی سال ہونے بجای جا چکی ہیں۔ کئی کے چار چار پانی پینے بھی ہو چکے تھے۔ کئی اپنے طور ہوں کی نظر میں پرانا گھسا ہوا مال ہو کر سیکے میں پڑی تھیں اور وہ صاحبان کے تعلیمات تک کے درمیان اپنی بھائی پرانی گڑبگڑا رہی تھیں۔ لیکن ایک وہی نہ جانے کیسی قسمت نے کرائی تھی کہ اب تک اس کا بچھوٹی بیوی پر کسی نے عیاں بھیجے کی زنت نہ گوارا فرمائی۔ صورت قفل کی کو تو ایسی بری بات بھی نہ تھی۔ بڑی سھل اور بے سہاری لڑکی تھی۔ اپنی بات ضرور تھی کہ سوائے اس کے اور اس کی ماں کے کسی کو اتنی فکر نہ تھی۔ باپ تھا تو اس کو صرف پڑے پڑے حق چاہتے اور دوسرے سال ایک عورت کے اضافہ پر فکر کرنے کے علاوہ تیسرا کام نہ تھا۔ بڑا بھائی سوائی گھر میں تھیں۔ آج وہیں پر عاشق تو قیل مجرانی پر فدا ہو چکے تھے بھی نہیں۔ کھلم کھلا جہان بھن کے سامنے آئے تھے بھرے چنچر سے لینے اور جا بجا کھانے سے بھی نہ بچا۔

تو وہ کچھ ایسے ماحول میں سانس لے رہی تھی۔ ماں نے اس کی بھرپور جوانی کو خانہ داری کی سِل کے لیے بچہ دہا چاہا لیکن تو پہ ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ جب سوپ کا اراسہ سوپ میں نہیں رہتا۔ آپ نے بھی چوہے پر پکٹی ہوئی ادا تو دیکھی ہی ہوگی۔ اور یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جس وقت اہل آقا ہے تو ہند پاؤں کیے اور ہندی سے چٹائی کا ڈھکنا ہوتا ہے۔ اس طرح اہل میں بیکہ آ جاتی ہے اور اگر نعلی سے ڈھکنا نہ ہوتا ہے تو اہل اسے خود بخود اچھا کر اپنے لیے راہ پیدا کر لیتا ہے۔ خدا تو نہیں؟ ہاں تو اس کی زندگی میں بھی اہل کی کیلیت پیدا ہوگئی۔ حیا کے بوجھ سے بھی ہوئی انھیں کچھ محض نے کے لیے اصرار اٹھائے تھیں۔ دینے تو بڑوں کا مکان عرصے سے خالی پڑا تھا۔ لیکن اصرار کو کوئی طالب علم آ رہا ہے۔ بس کیا تھا؟ زمین کے پیٹ میں بیچ و تاب کھاتے ہوئے اور کچھ پڑنے کے لیے زمین کی کڑور پر تھل گئی۔ کام کاج کرتے کرتے اس کی نظر میں اس دیوار کی طرف اٹھ جائیں۔ جس کے پیچھے کوئی چٹا کھڑا ہوا رہتا تھا۔ اس کی غور فرما سہیں پر ماں کا لباس کوٹنے دے رہی ہوئی۔ لیکن اس کے کانوں کے پردے وہ بھاری سی آنکھیں آواز اپنے میں جذب کرنے کے لیے پھاڑ پھاڑتے رہتے۔ گھر میں ماں باپ آپس میں جھگڑتے ہوتے اور وہ خیال ہی خیال میں دوجار پار کر کے کسی کے پہلو سے جاگتی۔ لاوا جڑ تھا۔ اس اندری اندر جوش کھار تھا۔

”کوٹھے پر کیوں جا رہی ہے؟“ بڑا بھائی بڑا مابہر لہجیات۔ اس کے ہاتھ میں راکھ ہوا گیا۔ وہ پند بھگتی کر رہا گیا۔

”وہ پند کھاتے“ اس کی تیری پر تھل آ گئے۔ بھوکے کے سامنے سے قتال سرکائی جائے اور اسے صبر نہ آئے۔

”کیا یہاں دھوپ نہیں ہے جو اوپر جانے کی ضرورت ہو؟“ اس نے ایک باغیرت بھائی کی طرح اسے بھلی ہوئی نظروں سے گھورا اور پھر ایک گھٹیا قسم کی سرکٹ لٹائی۔ وہ بددلتی ہوئی دو پند پنگ پر پیچک کر بیٹھ رہی۔ بھائی مطمئن ہو کر گھٹانے لگا۔

”نہیں میں محتال آئے ہو پند گنگے خالے“

اور وہ چڑ کر دل میں کوٹنے دینے لگی۔

اگر دیکھا اگر دیکھا۔ کوئی بھی اس کے شرق میں حار حق نہ تھا۔ فوڈا کتنے دن سے وہ اس سوراخ سے بھاگنے کی چھٹی تھی۔ اس نے موقع پا کر جلدی سے اپنی آنکھ اس نئے سے سوراخ سے لگا دی۔ تھوڑی سی دیر بعد ایک گورا چٹا سا چہرہ سامنے آیا اور چپ سے گزرا گیا۔ ایک جھلک صرف ایک۔ اس کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ کاش ایک بار وہ اور سامنے آ جائے۔ وہ بچی آنکھ سوراخ سے لگائے رہی۔ بس بہت سوراخ بھی تو ایسی جگہ تھا کہ تو یہی طرح چند کر جھانکا جا سکتا تھا اور تو بالکل کھڑے ہی ہو کر۔ بس اس پر بالکل کوٹھ کی کی کیلیت ملاری تھی۔ دونوں ہاتھ کھنکھوں پر آنکھ سوراخ پر اور کان کمرے کے دروازوں پر۔ بھگتے بھگتے کر دکھائی۔ ہاتھ من پر گئے



”ذبح کروں گا اسے بس کوئی روکنے نہ سکے۔ کہہ دیتا ہوں۔ اور ہر سے جو کراؤ آئی ہے مردانہ“ باپ کی حالت مارے غیرت کے غیر ہو گئی۔ لیکن شاہش نے کہا ہے سے باہر تو تھا لیکن کہہ دیتا تھا۔ چپکے چپکے۔ ارے اس کوئی اور مجھے والے سن لیں تو۔۔۔ تو۔

بڑا بھائی شاید اپنی کسی نئی مشوق کا خواب دیکھتے دیکھتے چھوٹا تھا۔ اس لیے اس کی جو حالت تھی بس یہاں سے باہر۔ دوسرے وہ سختی ہی بارشاہروں ہی اشاروں میں اسے سمجھا بھی چکا تھا کہ ”دیکھو یہ کون ہے اس میں کسی کی بہن کو نہیں گرا چاہیے۔“ اس پر بھی نہ مانی تو یہ۔۔۔ بس چوٹی پکڑی اور بڑا شروع کے بیٹھے۔ باپ کی غیرت اندری اندر چھوٹا تھا۔ اب جو اتنا آسان طریقہ دیکھو خود کو جیت گیا۔ لیکن ماں چونکہ باہر ہو یہ امید تھی۔ اس لیے صحت سے گریز کر گئیں۔ وہ بچے بھی تھی خاص قسم کی گالیاں یاد تھیں ہر بھر کہ برائی جاری تھیں۔ لیکن وہ بے انتہا تکلیف محسوس کرتے ہوئے بھی بچہ نہ نکلتی تھی۔ ارادے کی ناکامی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے اور بزدل ہی دنیا سے خوف کھاتا ہے۔ اس میں اتنی بھرتی نہ تھی کہ ان مجرم شخصوں کے خلاف زبان باندھ سکے۔

کتنے ہی سینے کڑے تھے اس واقعے کو۔ وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح بڑے بھائی کی میاشیاں ”بیٹا ہے“ یہ عمری ایسی ہوتی ہے ”کہہ کر بھلا دی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے حرم کو کتاہ کو بھی فراش کو دیا جائے گا۔ لیکن بھلی عورت کی حیثیت کو بھول گئی۔ عورت ایک کھ پتلی ہے جس کی دور ستان کے کوڑھی ہاتھوں میں ہے اور ان کوڑھی ہاتھوں میں جب چلے ہوئے لنگی ہے تو ڈور کے بھنگوں سے یہ کھ پتلی لپٹائی جاتی ہے لیکن اگر اس کھ پتلی میں جان پڑ جائے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق حرکت کرنے لگے تو تھوڑے سا تھوڑے کا لٹوہ بڑا ہوا سزا خاندانم کس سے دلچسپی لے۔ وہ سوچتی تھی کہ جس طرح اس کے گھر والے اس کی جوانی کے قصص کی طرف سے کان بہرے کر کے جھوٹے رہے۔ اسی طرح اس واقعے کو بھول کر اپنی لکٹی کو تسلیم کر لیں گے۔ لیکن پھر اس کا خیال تھا۔ اس کے فریضہ صفت سر پرستوں کی نظر میں اس کی زندگی پر کتنا وہ کی جو فراش آگئی تھی۔ بھلا وہ کبھی مت بدل بھی ہو سکتی تھی۔

”چھوٹا“ اس کا بھلا بھائی بڑا ہی بات پر کھڑا تھا۔

”اری“ اس کی اتنی صورت ہی دیکھ کر ایک سانس میں سمجھ گئی گالیاں سناؤ آتی۔

معمولی فراش لمن طعن کے زہر پہنے عاتقوں سے کر دی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ فراش ایک بڑا سا گھوڑا باندھ دی گئی۔ ایسا گھوڑا جو اندری اندر دھڑکنے پر بڑا ہوا ہے اور پھر اس کا زہر زندگی پر سگرات طاری کر دے لیکن خود ایک ہاتھ پھر بھی چپن نہیں لیتے۔

”یہاں کیوں پڑی ہے؟ گھوڑی کو بخار دے رہا ہے۔ اس پر یہ لوہور صوبہ گھر میں جاتی ہوں کہ سب کا سنگ جیتہ کر کاہے کہ وہ دل کھٹے گا۔ بات جیت ہوگی اور جی بھلا دھیان کھٹے گا۔“ اس کشتائی ہوئی کتا لے پانے میں جا گئی۔

اس نے نہ حال ہو کر اپنی چاکس سیٹ لیں۔ باورچی خانے کی چھت پر مسٹر سے بندہ اپنے حساب ذمی بندہ کا طالع کر رہے تھے۔ اس کے چنے میں درد پھر اٹھنا لیاں لینے لگا۔ علق سے چنے تک سرسراہٹ اور پھر وہی ہڈیوں کا جھٹکا ہوا گودا اسے اندری اندر تلنے لگا۔

”اٹھا“ اس نے لکھ کر پکارا اور پھر اپنی فریادی نظریں نیچے آسان کی طرف اٹھائیں جو ایک وسیع ڈھکنے کی طرح دنیا پر دکھا ہوا تھا۔ نظریں دیر تک ڈھکنے کے اس پار جانے کی کوشش کرتی رہیں۔ جہاں اس کے خیال سے انصاف و نرمی دنیا ہی تھی۔ لیکن فریادی نظریں ڈاکم رہیں۔ صحت کرا سے خیال آ یا کہ اٹھ سیاں اپنی دنیا کو آسان کے ڈھکنے سے اٹھ کر بالکل اس طرح طعن ہو گئے ہیں۔ جس طرح وہ ایک دن کنوڑے میں بیٹی بھلی دال رکھ ڈھک کر طعن ہو گئی تھی۔ لیکن جب ایک گرم دوپہر کزرنے کے بعد اسے دال کا خیال آیا تو دیکھا دال سڑ کر بچھا رہی تھی۔





اپنے ڈیسک میں چھپا دوں گی۔ اسٹیجی کو کالوں کا نخر بھی نہ ہوگی۔ پھر چمکی کے جنت اے نکال کر سب فریڈ کو دکھاؤں گی۔ سب کا دل لپکے لپکے گا۔ کوئی کہے گا ڈرامہ میں کون دس لے لینے دو اے کوئی کہے گا یہ کتنی اچھی ہے۔ ادب آخر میں کسی کو کھاتھ توڑے لگائے دوں گی اپنی ظلم کو۔

تھوڑی دیر بعد میں اے اٹھا کر اپنے پارے مگر کی ہر کرانے لے چلی۔

”دیکھو بی بی ظلم آپ بے ہمارے اہماں کے طے کا کرہ ہو کر آنے کی تکلیف نہ کرنا۔ کیونکہ تمہارا بیٹا کتابوں سے بھرے رہا۔ یہ دیکھو کھانے کا کمرہ چنے میں آسکتی ہو کر ڈرامہ نویس سے۔ یہ پسند کہ برتن تو ڈرامہ نویس۔ یہ ہاپا رچی خانہ یہاں جب تمہارا ہی چاہے شوق سے آجایا کر کر بھی بہت ہو چھاری سے کیونکہ یہاں پر ہے سوئی رحمن کا راج اور وہ غصہ دہی ہے۔ اگر اس نے بھی تم کو کسی ہنڈیا میں بند کر دے گا تو کھانے کی سہارا کی جگہ توڑے گی۔ بس پھر تم غلام دین گئے کی میں ہو کر وہ چڑکی۔ کبھی کبھار مگر غمزدہ کسی۔ یہ تم میرے گودے لٹکے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ اے لاکو کو گئیں دم سے۔ اچھا اچھا میں بھی جیسیں ہو کر گی ہے۔ تو تم میں جیسیں چپکے سے چائے کا دودھ دیتے رہتی ہوں بی۔ نو۔ پھر تھوڑی دیر بعد چائے پینے کی تو خوب بہت کی جیسیں دوں گی۔ اچھا ارے ظلم اتنی تھکی ہلدی اتنا بہت سا دودھ ملاپ گئیں۔ خیر شرمنا نہیں مجھ سے آؤ اب جیسیں ملاقات کا کر دے کھاؤں۔ یہاں تم ہر وقت یاد رکھنے آسکتی ہو۔ اہماں کے چنے دوست آجیں تم بھی ان سے دوستی کر لینا۔ وہ سب مجھے یاد کرتے ہیں۔ اس لیے جیسیں بھی ضرور یاد رکھیں گے۔ اچھا دودھ کھو دو ہے سنا ہے دادا مہاں کا کرہ۔ کان کھول کر سن لو کہ بھول کر بھی دودھ کا رخ نہ کرنا۔ وہ سنا ہے کچے سے تمہاری کر توڑ دی جائے گی۔ بڑے بکٹ خان صاحب ہیں وہ۔

ظلم نے مہاں کر کے کچے میری تمام ہڈیوں میں لٹیں۔

”کیوں کچھ دینا آج تمہارے اہماں اب تک نہیں اٹھے سو کر رحمن نے مجھ سے گوفی کے کچے میں در یافت کیا۔“  
 ”ایں اہمیں کیا معلوم؟ لگ رہی ہو اہمیں سردی۔“ کیوں نہ ظلم؟ میں نے ظلم کے دھیمی دھوک میں اپنا کال رکھتے ہوئے کہا۔

”مہاں؟“ گویا میں نے کہا۔ ”اور کیا؟“

”چلو بی بی ظلم اب سکول جانے کی تیاری ہو جائے۔“ جب میں اور ظلم ڈاک کر تاشو کر چکے تو میں نے جبر جبر پٹی کی۔  
 ”تم یہاں کھانا میز پر بھی رکھو ڈرامہ نویس فرائڈ کرلوں۔ جب تک تم چیشے میں اپنی صورت دیکھو۔ ارے تم نے کریم کی

ان کے ہونٹوں پر چمکی کی مسکراہٹ برائی اور انہوں نے نہایت نرمی سے ہدایت کی کہ میں اپنے میز پر چلی جاؤں۔ اور میری حیرت کی کوئی اگتھا نہ رہی۔ جب انہوں نے بی کے لیے کوئی حکم نہ دیا۔ حالانکہ وہ بیٹوں اور دوسرے پاپا جانوں سے بہت چڑتے تھے۔ میں خوش خوش بی کر اپنے میز پر لے آئی۔ اور پھر رات گئے تک ہر طرف سے خالی انداز میں ہو کر اس کے صاف سحرے اور دھکی ہوئی روٹی کے بانڈو گودے جسم سے کھینک رہی اور وہ بھی میرے کھیل سے محظوظ ہو کر غور سے کرتی رہی۔ اس رات وہ میرے پہلو میں سوئی میں غنیمت بھی اس کے بیٹھی جسم کی ہلکی ہلکی گرمی برابر محسوس کرتی رہی۔

”میر میر آج کچھ ہی سویرے سے کھل گئی۔ کیونکہ بی میرے پہلو سے غائب تھی۔ میں چپکے سے اپنے میز سے اٹھی اور ادھر ادھر دھونڈنے لگی۔ آخروہ آتش دان کے قریب سوئی ہوئی بی۔ میں اسے پکڑ کر میز پر لے آئی۔

”بھئی اب بتاؤ تمہارا نام کیا رکھا جائے؟ میں نے اسے اپنی گود میں لانا کر سوال کیا اور اس نے بڑے دھم سے مہاں کر کے آگئیں بند کر لیں۔ جیسے اس نے کہا ہو۔“ بھئی جبری چاہے کہ لڑائی تو بی ہوں بی بی رہوں گی۔“

انہیں میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اس کی ایک لکھی میں جو لکھ چکا ہے اسے وہ ظلم بتی ہیں اور چونکہ اس کی بی آگئیں بھی چیشے کے نیچے لگوں کی طرح ہیں۔ اس لیے اس کا نام بھی ظلم ہی اچھا ہے گا۔

”دیکھو بھئی میں نے تمہارا نام ظلم رکھا ہے۔ جیسیں کوئی اعتراض تو نہیں آخروہ نے بھی اسے اپنا فیصلہ بنا دیا اور اس نے اپنے راجت اس طرح لگوں دے دیے جیسے میری بات پر فخری آسکتی۔ پھر اپنی چھوٹی سوچوں کو دھکا کر مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ شاید وہ یہ سوچ رہی ہو کہ انسان بھی عجیب ہوتے ہیں کہ کچھ تو چاہتے ہیں پھر بھی کئی کو ظلم بنا دیا۔ لیکن میں نے اس کے ان خیالات کی کچھ یاد نہ دہائی اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کے حوصلے سوچنے لگی۔

اہماں نے تو کچھ اعتراض نہ کیا۔ اس کی بڑی سچی سادگی ہیں انہیں ایک باتوں سے کیا مطلب۔ اب رہے دادا مہاں سو وہ ضرور ڈاک ہوں چڑھیں گے اور چھوٹا بھائی ڈرامہ نویس کرے گا۔ کچھ رحمن اسے اپنے پاس اس طرح رکھوں گی کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ہو۔ خود تاشو کرنے سے پہلے اسے تاشو کر دیا کروں گی کھانا کھانے سے پہلے اسے کھانا دیا کروں گی تاکہ میز پر اپنا کچھ نہ کرے۔ رات کو اپنے ساتھ ملاؤں گی۔ دن بھر اپنی گود میں رکھوں گی۔ مگر بھی دن بھر کیسے؟ اسکول بھی تو جانا ہوتا ہے۔ خیر کچھ بھی ہو میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی۔ ان بی بی ظلم کی آگئیں مکمل جائیں گی تمہارے سکول کے کھاتے ہاتھ دھو کر۔ اور پھر سب کی دیکھا دیکھی ڈرامہ نویس بھی آجائے گی۔ لیکن اسٹیجی جی جبر چڑھیں ہوں گی کہ بی کو کیوں اسکول سے آگئیں۔ تو ایسا کروں گی کہ اسے



بھی گئی۔ جب آٹھ گھنٹے تک کھڑی رہی تو کمر میں سنا تھا۔ میں اُری کرب مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے شاید۔ میں نے اُرتے اُرتے باہر جھانکا۔ آگین میں بہت سی عورتیں بیٹھیں اور ان کے درمیان لہان لپٹنے پر غصہ ڈیڑی ڈیڑی آگھیں بچے آٹھ سو بھاری تھیں۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں چڑیاں بھی نہ تھیں۔ حالانکہ کچنگ کھانچوں میں ٹھنک رہی تھیں۔ اور آج تو انہوں نے اپنے بالوں میں کھنکھس کر کے چنی بھی نہ گوندھی تھی بلکہ لمبے لمبے بالوں میں خاک دھول اپنی ہوتی تھی۔ میں دوبارہ کھم کرنے میں دیکھ رہی۔ اب مجھے ظلم کا خیال آیا۔ وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اگر وہ ہوتی تو اس سے پہچانتی کہ تجھے معلوم ہے تلخ سب کا سہو رہا ہے؟ کمرے سے باہر نکلے دو معلوم ہو رہا تھا۔ اس لیے وہیں ٹھہری اسکا اٹھار کرتی رہی۔ تمیزی ہی دیر بعد وہ دم پلائی میاؤں میاؤں کرتی آئی اور میں نے اسے پکار کر اپنی گود میں بٹھالیا۔

”ظلم اور جس کبھی تھی کہ اہمیاں سر گئے۔“ میں نے کہا۔

ظلم نے اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے مجھے داکا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان نیلی کاجی کی دیم اوروں کے پیچھے بہت سے آنسو ٹپک جانے کے لیے سرگرا رہے ہیں۔ ”میاؤں میاؤں“ میں بھی کہہ رہی تھی۔ ”ہائے!“

بھر وہ اپنی لمبی دم میں اس طرح زمین پر پٹختے تھی جس طرح لہان لپٹا پتھر پٹک رہی تھی۔

اس روز شام کو دس گھنٹے پر سوائے ناش کی کچھ اور کچھ نہ تھا۔ جو نہ تو مجھ سے کھائی گئی اور نہ میری ظلم سے۔ اس کے بعد لہان لپٹتی تمیزی دیر بعد روٹی رہیں۔ وہ اہمیاں رورہ کر پتا پتا کھینچنے کو رہے۔ آگے گئے بھی ہانے دانے کرتے تھے اور رات بھر بادل بھی چٹخ چٹخ کر دیتے رہے۔

صبح میری آٹھ اس وقت کھلی جب وہ اہمیاں زور زور سے کہہ رہے تھے۔ ”بہو! تم نہ ٹوٹو لیکن بیڑی بڑی ٹھوس ہوتی ہے۔“

میں نے کھمرا کر اپنے پہلو میں ظلم کو لٹا دیا لیکن وہ قاف تھی۔ میں نے خلاف سے متکال کر دیکھا تو اس کی بیڑی ہی گردن دادا مہاں کے سوتے ہوئے دبچاں تھی۔ میں دیم اوروں کی طرح دوڑی اور اس کی گردن کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے چاہا۔ لیکن انہوں نے میرے گال پر ایک غلامیچہ پڑا اور میری اسناتی ہوئی آنکھوں کے سامنے بڑھ چڑھتی رہ گئی۔

”اہمیاں! اسے اہمیاں اُلی کو مارنا بھی تو بڑا ٹھوس ہوتا ہے۔“ لہان لپٹتی صورت میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند میں اچانک ابھرا آئی۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں اور پچھلے بھاری ہو کر آنکھوں پر ٹھٹک آئے تھے۔

”بہو! میں اس ٹھوس کو اپنے کمر میں نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ اہمیاں ہولت چہا چہا کر کہنے لگی۔ ان کی دھنسی ہوئی آنکھیں جیسے معلوم

سے اُلی پڑی تھیں۔

”گمراہ اہمیاں! یہ تو اہمیاں کے سامنے گمراہی تھی اور انہوں نے اسے کچھ بھی نہ کہا تھا۔“ میں نے اپنی ظلم کو ان سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”وہ کچھ کہتے کیسے؟ اس ٹھوس نے تو ان کی زبان ہی بند کر دی تھی۔“

دادا کی آنکھوں میں ایک دم آنسو آگئے۔ لیکن ظلم کی گردن ابھی تک ان کی گرفت میں تھی اور وہ اچھلتی بے بسی سے لگی ہوئی کھنکھس کر رہی تھی۔ وہ اہمیاں نے میرے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے کہا۔ ”بھئی! بیڑی بڑی ٹھوس ہوتی ہے۔ دیکھو جس دن یہ کمر میں آئی موت کو ساتھ لائی تھیں، اب اپ جھٹ پت ہو گیا ہر بار باغ اڑا گیا۔ میرے بڑے چاہنے کی لاشیں بچن گئی اور۔۔۔۔۔“

ان کی آنکھیں جیسے معلوم سے اُٹھ پڑیں۔ چہرہ لال لالکا، دھاڑی کے بال کھڑے ہو گئے اور بھر وہ جھٹ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اہان لپٹتی تھیں اور ان کے کمرے کے بند کواڑوں کے پاس جا کر کھینچ لگیں۔

”اہمیاں! میں ہاتھ جوڑتی ہوں اس کی جان نہ لیجئے گا۔“ اتنا کہہ کر ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنے گتے ہاتھ کھینچے زور دیا کہ ان کے لگا کر دے لگی۔

میں خوف سے لرزتی ہوئی دوبارہ اپنے بستر پر آئی جس پر میری ظلم کے کئی ایک سفید روئیں کانپ رہے تھے۔ میں خلاف میں کھنکھناتی اور سرک کر سو جاتی رہی کہ وہ اہمیاں کہتے تھے۔ ظلم اپنے ساتھ موت لائی۔ مگر وہ تو بالکل اکیلی تھی۔ سبھی نے ہی دیکھا تھا۔ وہ اہمیاں اسے بڑے ہو کر جھوٹ بولتے تھے اور بھر یہ بات تو کسی طرح مجھ میں آتی ہی تھی کہ اہمیاں کے چلے جانے سے ظلم کا کیا تعلق؟

”تم نے اب تک نہیں سیکھی ہے ٹھوس!“ اہمیاں نے زور سے کہا اور جیسے یاد رفت کا ظلم اچانک جل اٹھا۔

میں نے اپنی گودی کی زم زم گرم لپٹ کو غور سے دیکھا۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے کاجی کے ننھے ننھے آسمانی جالوں میں لرزتا ہوا قطب پانی۔ میری طبیعت بہت زیادہ واس ہو رہی تھی۔

”اہان لپٹا ایک تو بتا ہے!“

”کیا بات؟“ وہ جھرت سے بولیں۔

”ظلم! میرے بچپن کی چھٹی نیلی کا کیا اچھام ہو تھا؟“

## نغمے میاں

مردانے کمرے میں نغمے میاں اور ان کے دوست بیٹے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں بھی ایسی جرابار بار کاٹا پھرتیوں میں تھیں جو جانتیں۔ لیکن نہ جانے کیوں نغمے میاں کی خوبصورت آنکھیں پوچھل ہوئی جا رہی تھیں۔ اور پھر وہاں بس بھونکا دور دورہ کر پھلو پھل رہے تھے۔ ان کا دوست جو عمر میں ان سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ اپنی چلیاں کھٹکھٹا کر کھسک پھرتی کرتا جا رہا تھا۔ "اماں بس کرو" نغمے میاں بری طرح کسمسا کر بولے۔

"سنتو یا راجا ایک دن وہ آگئی مہمانے میں۔" وہ ہر سرگوشیاں کرنے لگا۔

نغمے میاں کا چہرہ ایک بڑا سا دکھتا ہوا اٹکا رو معلوم ہونے لگا۔ وہ ایک جیب کی فسی بننے لگے۔

"بڑے بدعاش بھق۔" انہوں نے لپکا کر کہا۔

"اور میں تو کیا تمہاری طرح شریف۔" دوست نے تر سے جواب دیا اور نغمے میاں کو جیسے اس نے کوئی گھٹاؤنی گالی دے دی۔ جس جھٹکایا ہوا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ دوست نے ان کی دل گلی کے بعد وہ کسی سلیپ ڈاگھی والے بڑے میاں کی طرح نامحاذیہ اچھا اختیار کیا۔

"سیری ناواس شرافت میں کچھ نہیں ہر رہا ہے۔ ایک دن چلو تو میرے ساتھ دنیا میں فنت دکھا دوں۔ کیا خیال ہے چلو ہے؟"

نغمے میاں نے جواب میں شرما کر گردن جھکا لی۔

"تو کھانوں کے آج؟ بڑی تفریح ہے کئی۔"

"آج نہیں بھکر کی دن دیکھا جائے گا۔"

وہ بیٹھ تفریح کے موقعوں پر کھڑا جایا کرتے تھے۔

تھوڑی دیر کی حیرت گپ شپ کے بعد دوست تو چلتا ہوا۔ لیکن نغمے میاں جیسے بیٹھے تھے۔ ویسے ہی بیٹھے رہے۔ ان کی خوبصورت آنکھیں سڑک کے اس پار لوہی، اونچی عمارتوں کو کھجلاکتی کہیں خدا میں کچھ ٹھہر رہی تھیں اور ان کے چہرے پر فوجانی کے خون کی

"اے تمہارے دادا میاں اپنے ہاتھ سے بوری میں بند کر کے کتاب میں پھینک آئے تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں پھر وہ مگر واپس نہ آ جائے۔" ان کی آواز میرے کانوں میں اس طرح آ رہی تھی جیسے آندھی کے جھکڑوں میں کوئی دور سے حرا تر پکار رہا ہو۔

"دھپ۔" روٹی جیسی ملی تو ہم پرست انسانوں کی شقی القلمی پر تر پٹی اور کوڑ کر کھڑکی سے نکل بھاگی۔

"تعلیم انظہار" میرے داغ پر وہ نئی روٹی کا چھایا ہوا لکھنا تھا تو وہ آہستہ آہستہ بھاری ہونے لگا۔





سرخیاں، رنگ، ری حسی۔ نہیں بار بار یہ محسوس ہوا تھا کہ ان کے بازوؤں میں چھپائیاں توپ رہی تھیں۔

ان کا ہاتھ بڑا کھڑا تھا۔ لیکن انھیں سب ننھے میاں کہتے تھے۔ کھاتے پیتے گھرانے کے لڑکے پات اور کھلے کے شریف و دلچیزہ لوگوں میں گئے جاتے تھے۔ اس لیے کھلے ہر کام میں ننھے میاں ننھے میاں کہتے ہو سکتا تھا اور واقعی ننھے میاں تھے بھی اس نام با کسی انھیں میں کائن کاٹھ میں پڑ جاتے تھے اور غضب یہ کہ وہاں کتنی ہی لڑکیاں کا ہر وقت ساتھ لیکن کیا محال جو کسی کی طرف نظر اُڑا کر دیکھتے بکڑے ہائیں۔ بس جیسے ان دنیا میں رہتے ہی نہ تھے۔ اس کے برعکس ان کے تمام دوست اول درجے کے تیز مزاج توپ کچکے ہو ایک ہل کے لیے نچلے تھیں۔ کم بختوں کی رگ رگ پہنچا کر رہتی۔ خصوصاً ساتھ پڑ جاتے دانی کو چھپرنے میں تو کسی وقت نہ چرکتے۔ پروفیسر صاحب تو سمجھتے کہ جوار سے طلباء اس اہلک سے بچیں کہ انھیں اس کا پتہ نہ ہو کہ ان میں سے نہ جانے کتنے اپنے پیچھے بھی ہوئی لڑکیاں کی پنڈلیاں پر اپنی ایزبوں سے فوطیں لگا رہے ہیں۔ غرض ایسے نچلے لوگوں کے متعلق میں ننھے میاں بدحوہماں کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ یہ تو جیسے خیر ادا پر ہی تھیں۔ لیکن اصلیت یہ تھی کہ ننھے میاں ضرورت سے زیادہ شریف و عارف ہوئے تھے۔ ویسے تو ان کا ان کی کھجی جی چاہتے تھا کہ وہ بھی لڑکیاں کو چھپائیں اور بھران کی جلتی ہوئی نظروں سے اپنی رگ رگ میں حرارت سمیٹ لیں۔ لیکن ان کی کھت نہ پڑتی۔ جہاں کسی لڑکی کو دیکھا اور حواس باعث ہوئے۔ پھر ہا ہر جود کوشش کے نظر اٹھانے نہ اُٹھتی۔ گویا ایسے مقصود پر ان کی آنکھوں پر جگر کے دوڑے دوڑے بڑے بڑے گھرے رکھ دیے جاتے اور ان کے دماغ کے گوشے گوشے میں ان کا ایک چشمہ واقع ہوا جیسے کچھ کے ذہن کی طرح گزرنے لگتا۔ بات یہ تھی کہ ایک دفعہ بھائی کے بار بار آواز سے کہنے پر ایک لڑکی نے مشتعل ہو کر بھرے بازو میں انھیں طرح اس کے سوت کی چوٹی چھوڑ دی تھی۔ بس انکی ہی چند باتیں تھیں جو ان کی راہ میں حائل تھیں اور وہ محاکمات و اشتراک مشہور ہو گئے تھے۔

ادھر کچھ نوجوانوں تو انھیں اپنا شریف ہونا ہر معلوم ہوا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب ان کے بے تکلف دوست اپنے عشق کی داستانیں بڑھا چڑھا حاکم بیان کرتے کہ کس طرح ایک صاحبزادی سے عینکس بڑھیں اور آخر کار وہ ان کے ساتھ چل دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ لیکن ننھے میاں کے دوست کوئی بھی عمر بھر کا پند لکھا کر دیتی کرتے تھے؟ بس یہیں آ کر کٹر عشق کی پہنچتی ہوئی داستانیں دم توڑ دیتیں۔ ننھے میاں یہ سب سن کر بہت مضطرب ہو جاتے اور انکرا اپنے ارد گرد کھلی ہوئی کتابوں میں سے کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگتا کہ وہ جھڑی دیر کے لیے ان داستانوں کی دیکھیں لڑکیوں کو کڑھ کر دیکھیں جو ہر وقت ان کے دماغ میں گھسی رہا کرتی تھیں۔ لیکن کتاب کے صفحات پر بھی وہی طرح اور دیکھیں لڑکیاں انھیں نظر آتیں۔ جن کے گرد ان کے دوست کال کے بارے کتوں کی

طرح منظر لایا کرتے۔ وہ لڑکیاں جن کا قصور ہی ننھے میاں کے دل میں گواہی کرنے لگا تھا لیکن ان کے دوست کہاں ایسے سیدھے؟ وہ ان کے اضطراب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی کھتی کھاتے اور ننھے میاں جوار سے قائل رہم حالت میں بیٹھے سب نہا کرتے اور بھی گئی بات تو یہ تھی کہ جب کبھی اتفاق سے ان کے دوست انکی باتیں نہ کرتے تو وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگتے کہ خدا کرے کسی طرح وہی موضوع چھڑ جائے اور جب وہی باتیں شروع ہو جائیں تو وہاں طرح طرح ہو جاتے جیسے کوئی ان کے چنگیاں لے رہا ہو۔ ان پر تو وہی بس بھڑکی جی میں پھینکی جی کر ڈاٹھے بھانے نہانے بن سہانے نہ۔

ایک دن جب وہ اپنے ایک لیکن لیکن کے ماقبضہ کے دوست سے سرگرم گفتگو تھے تو کمرے کے سامنے سے ایک عورت نکلی سی عورت میں بیٹی چاندی کی موٹی موٹی ہماروں میں پھنسے ہوئے پاؤں لپکتی تھی۔ اس کے اسیے پر ایک سلی کیلی دھکی آگھوں والی بیٹی ساری کتے ہوئے تھی۔ ننھے میاں کے دوست نے اپنی چوٹی آنکھیں جن میں ہلا کی تیزی تھی تعاقب میں ڈال دیں۔ عورت ننھے میاں کے گھر کی ڈالڑی میں داخل ہو گئی۔

”یہ کون ہے؟“ دوست کے مونے مونے ہونٹ پکڑے۔

”لو طوطی کی عورت ہے؟“ ننھے میاں نے بے پرواہی سے جواب دیا۔

”یاد رکھا چھوڑا ہے ہاں آتی رہتی ہے؟“

”ہاں“ ننھے میاں کو کھوت ہو رہی تھی کہ اس سلی کیلی عورت کے لیے اتنی کھوت کس لیے؟

”جھاڑی خم بڑے بد مذاق ہو۔“ ننھے میاں نے اپنی آنکھیں دوست کے چنگی لی۔

وہ بھلا وہ اس کی کنیوں پر ہجریاں کا جال بچ گیا۔ وہ فلسفیانہ انداز میں بولنے لگا۔

”دوست! احسن کنیں بھی ہو وہ وہ قائل القاف ہے۔ ہر دم جانتے ہو کہ احسن کیا ہے؟“

اس کی بھولی آنکھیں ساکت ہو کر ننھے میاں کے چہرے کا ہار لے لیتے تھیں۔ ننھے میاں کے طائر جیسے پر ہزار ہی اپنے قدم جما رہی تھی۔ انھیں اس طوائف کے خصلت جو بڑھاپے کی حد میں قدم بڑھا رہی تھی اور جسے کھلے میں تقریباً کسی چابی کہا کرتے تھے۔ ایسا سوال زہر معلوم ہوا۔ مل کر بولے۔ ”جیسے جانا تو چھوڑا ہو۔“

”احسن نام سے عورت کا جو راس؟“ وہ صاف نکال کر دوسرے چٹنے لگا۔

”بس اب سوچ لکھو کہ میرے اس کتے کو میں تو چلا۔“

اور واقعی جب وہ چلا گیا تو نئے میاں گم تھے۔ ان کے دماغ کے پردوں پر چائی بھانجہ کے جھانگن کے ساتھ حرکت رہی تھی۔

آج سے قبل انہوں نے سینکڑوں دفعہ چائی کو دیکھا تھا اور اس سے باخبر کی تھیں۔ چائی کو جب بھی اپنے نیچے لٹکھواتا ہوتا تو نئے میاں کی خوشامد کرتی۔ ویسے تو مجھے میں اور اس سے بھی یہ کام کھل سکتا تھا۔ لیکن مجھ پر یہ تھی کہ اسے خدا کا مضمون اچھی طرح جانتا نہ آتا تھا جس سے دوسرے کھینے والے بھٹھلاتے۔ لیکن نئے میاں چونکہ بڑے سہ سے سادے اور اجڑل چائی سب سے زیادہ "کاشی" تھے۔ اس لیے وہ ہمیشہ نئے میاں سے ہی کھوایا کرتی تھی۔ وہ بھی تو اس ضرورت سے نئے میاں کے گھر آ جاتی اور بھی ان کو اپنے پاس بلا سکتی۔

نئے میاں گم دوات سنہال کر چار پائی کے ایک کونے میں بیٹھ جاتے اور دوسرے کونے میں چائی مع اپنی گود کی بیٹی کے براہیں۔ کافی فاصلہ ہونے کے باوجود نئے میاں ناک تیز تیز کر چائی کے کپڑوں سے آنے والی مخصوص قسم کی بسانہ برابر محسوس کرتے رہتے۔ چائی اکثر بڑی سہ نفعلی سے اسی جگہ بیٹھ بیٹھ اپنی ہلکی ٹوٹ پڑا کو دودھ بھی پلانے لگتی اور نئے میاں جیسے کٹ کر رہ جاتے۔

چائی کی طبیعت بھی کچھ عجیب تھی۔ چھاری کی ازدواجی زندگی بھیکیں کڑے مرحلے طے کر چکی تھی۔ لیکن عام ہندوستانی گھرانوں کی طرح میاں بیوی کے تعلقات جیسے جیسے پرانے ہوتے گئے۔ ویسے ویسے وہ بال جاتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر دو پالتو جانور کچھ دن ایک کھوتے پر بند بیٹھ تو آپس میں محبت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اللہ ہی جانتے یہ کیا بات ہے کہ وہ انسان میاں بیوی ہو کر جنگلی جانور کیسے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ٹوٹی چائی کے ساتھ برادر یعنی راتی۔ دوسرے تیسرے بک بک جنگ جنگ کے بعد جوتا کات کی فوج آتی راتی۔ اس کے باوجود چائی کے کان کی بیک سے سرخ ہونٹ زیادہ تر مسکراتے رہتے۔ بس اس وجہ سے مجھے واسلے سے جانتے کیا کیا کہا کرتے تھے کہ نئے میاں کو ان باتوں سے کیا مطلب۔ وہ تو چائی کو چائی سے زیادہ کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔

"ہاں تو میاں کھوتے" چائی مسکراتی ہوئی کہتی۔

"کیا کھواتا کی۔ ایک بار بول دو۔ میں سب کھودوں گا۔"

"بس کھودو میاں کہ آج کل بڑی تکلف سے گھر بار ہو رہی ہے۔ جس پر روج روج کی ہائے ہائے۔ اب تو دکھ ہو گئے کی تاکت نہیں۔ پر بھی تو کن کی لالچ لیے بیٹھی ہوں۔ جس پر تم سب بھی مری کوئی اچھی بری کے چھپا بیٹھیں اور میں مری جو جو بھی مان آدے

کھودو۔ سخی، سخی، چھرا سخی رانی! پتا چلتی سنو اور مری اس پتا کا نسا رکھی کھودو۔ نئے میاں کی اماں بچوں کی اس لمبی چڑی غمر سے سے چڑکھتیں۔ "اور جو پینٹ میں ہے اس کا نسا رکھی کھودو اور سخی۔" کچھ معاملہ یہ پتا کر شاید ہی کسی چائی کی گود خالی راتی ہو اور شاید ہی کسی پینٹ۔ چائی پینٹ والے بچے کا دم سن کر بڑے غرور سے سخی اور اس کے چہرے پر رنگ بکھر جاتا۔ جیسے یہ بچہ اسے کھوے ہی اس کی زندگی کا حاصل تھے تو خطا ہمیشہ کچھ اس مضمون کا ہوا کرتا جو نئے میاں ذرا کی ذرا میں لکھ کر چائی کی سینکڑوں دعا میں لیتے۔ دعا میں بھی وہی بیٹھیں وہ اپنے غریبے کے بعد جہاں کہا کرتی تھی۔

نئے میاں کی آنکھیں سوچے سوچے نہام ہو گئیں اور سر جھکانے لگا۔ اس توقع بیٹے کے بعد انہوں نے دل ہی دل میں اپنے سیکھے دوست کے الفاظ دہرائے۔ "حسن بھی کبھی ہلا وہ قابل القات ہے اور حسن کیا ہے؟ حسن نام ہے عورت کا۔"

بھانجہ کی بچن چھن نئے میاں کے کانوں میں جوی سے آ رہی تھی انہوں نے مرکز ذرا بھی میں کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا۔ چائی اپنی ٹوٹ پڑا کو کھپے پر بجائے کھڑی مسکراتی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو نئے میاں؟" وہ ہلے ہلے نئے میاں کے پاس آگئی اور کمرے میں کھنی کھنی بسانہ پھیل گئی۔ نہ جانے کیوں آج انہیں یہ بوجی بیاہی معلوم ہوئی کالج کی لڑکیوں کے کپڑوں سے آنے والی دھوئیں کن خوشبوؤں سے کہیں بڑھ کر۔ انہوں نے بہت دیر سے کہی پائی آنکھوں میں ایک دھواں جگ پھیل کر رہے تھے۔

"کچھ نہیں چاہا۔۔۔" وہ چائی کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ بجلا چو کوئی رشتہ تھا۔ چائی

"کھت کھواتا تھا ہوا"

"اس وقت میں شام کا کھانا کھا رہا تھا مگر"

"اچھا" وہ اپنی داغی راتی اور اپنی کر کے مزاک پر اتر گئی اور نئے میاں عرض میں ہلکی ہار سے حسن بکھر کر گھومتے رہے۔

"بڑی تو نہیں" انہوں نے جیسے کھلی عجب کچھ کہنے لگا۔

وہ آرام کر ہی پر پڑے پڑے سوچ رہے تھے۔ کیا ہوا اگر اس کی عمر چالیس سے اوپر ہے۔ ڈھلکا ہوا سورج چہ نسبت چڑھتے ہوئے سورج کے زیادہ مسخیں وہ کھل رہا ہے۔ آگے کے دودھ انت ذرا بڑے ہیں لیکن ہونٹ تو پختے اور سرخ ہیں۔ سرخی چاہے پاؤں کی ہی کہ جو۔ قدرتی سرخی تو کسی عورت کے ہونٹوں پر ہوتی ہی نہیں۔ جسے دیکھو کھنٹوں لپ اسٹک کے اسٹرو ہونٹوں پر چڑھائے بھرتی ہے اس کے چہرے پر بھریاں ضرور ہیں مگر بھی جسے برہنہ نہ مل لکھتا رہتا ہو۔ وہ بجلا چکا چڑا رہا ہو سکتا ہے۔ ان سب کے علاوہ گورا



## قل اوٹ پہاڑ

میں اور وہ ایک ہی ہوئی تھی۔ ہر بار کے کمرہ میں بیٹھ جاتے۔ لیکن ایک دوسرے سے قطعی باوقاف اور زیادہ تر اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی دکھائی دیتی۔ زبردستی ہنسی سنبھالنے دینی پڑتی تھی اس کے چہرے پر چھوٹے چھوٹے سہری ہال جو بالکل خشک اور سیدھے سے تھے۔ میڈیٹ پیسٹ پر بکھرے رہتے۔ مگر بھی کوئی دن گیارہ سال ہوئی لیکن مصیبت نام کو نہیں۔ جب پہلا اور کھرا چہرہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے سنبھل کر اسے غصوں کا حصار یاد آ جاتا۔ بس میں نے اسے جھکی نگاہوں سے اسی قدر دیکھا تھا۔ کیونکہ کم بخت کے سامنے نظر اٹھانے کی بہت بڑی ہی ذہنی قوت تھی۔ تاکہ برابری کو نہ دیکھ کر دیکھتی جیسے زبردستی میری صورت لہاس اور چال وصال میں کوئی حجب نکالنا چاہتی ہو اور یہ غصوں کر کے میرے جسم میں جیو تھیں اس کا نئے نکلتے۔ بس سب دل میں آتا کہ کم بخت کے کان کھینچ کر لگاؤں وہ جاننے کا آئندہ باہر نکلتے ہوئے مجھے جوں نہ تھا کا کرے۔ لیکن اس کا رعب کچھ ایسا تھا کہ پناہ ہی ملی جا کر وہ جاتی۔ ہو گا بھی دیکھنے کے۔ میرا کیا جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں دھسکی۔ میں بے پروا رہ کر لپکتی۔ مگر یہ بڑی ہے بالکل مہو۔ اگر میں اسے اتنی بھی جانتی ہوں تو تھوڑے دن بعد ہی سے غصوں کے مجھ سے دوستی کیوں نہیں کرتی۔ اتنے اتنے بڑے بچے تو بڑا ظلف اپنی پسندیدہ چیزیں دوسروں کے ہاتھوں سے چھین لیا کرتے ہیں نہ کہ یہ... ہو گا۔ مجھے کیا مطلب اس مجھے؟ ان کوئی دے دیے یہ ہدایت ہے کہ یہاں پر روز آدھ آرام کرو۔ سوچو یہاں سے بچ۔ مطلب یہ کہ سب دن میں سے اچھے ہونے کے باوجود وہ قاضی فرج کو کھانے دارغ کے نیچے یاد دلا رہا ہے۔ ہاں! جب اپنی صحت ہی شراب ہو تو پہلے فکر اس کی کرتا چاہیے۔ "اور میں بڑی خوش قسمت ہوں اس کی طرف سے بے نیاز ہو جاتی۔"

چندکے میں پہاڑ کی آب و ہوا کی عادی نہ ہوئی تھی۔ دوسرے علاقے اور پرہیز میں بھی کافی ہے تو بھی تھی۔ اس لیے سب تو بھلائی تھی۔ زکام ہوا کنکاشی بڑھی اور سینے کا سوا ہوا درد بھی جاگ اڑا۔ ممانی جان اور ایمانی جان پر گرام کے مطابق سنا جانے کے لیے تیار ہو چکے تو مجھے سوالیہ نظروں سے متوازا دیکھا جانے لگا۔ کیونکہ میں بھائے ساتھ جانے کے چٹک پر بڑی تھی۔

"آپ لوگ جاننے میں نہ جاؤں گی۔"

"زمین پر کیوں بیٹھ گئیں؟" انہوں نے اپنے منہ سے اس طرح آواز نکالی جیسے ان کی گدی پر کوئی گھرنے والا رہا ہو۔  
"چھٹک چلی ہوں" وہ سکراری تھی۔

"تو پھر نہیں نکلتے؟" انہوں نے اپنے حساب کو یا کوئی بہت سی روحانی جملہ ادا کیا اور بٹنے لگا۔  
"اچھا تو" وہ مع اپنی لٹو یا کے کھات پر آ گئی اور نئے میاں کی جاک میں کھلی کھلی بسانہ چڑھ گئی۔ وہ بے اختیار ہی میں اس کی طرف کھٹک گئے۔

"کھٹو؟ وہوئی۔"

"ظہر؟" انہوں نے اپنا کھانا ہاں رکھا لیا۔

"کسی طریقت ہے؟" چائی کچھ گھبراہٹ ہوئی تھی۔

"مجھے تم سے صحبت ہے؟" آخر انہوں نے اس کے سوال کے جواب میں چڑھی ہوئی سانس کے درمیان اگل ہی دیا اور پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر چائی کے گردن میں لپیٹ لیا۔ چائی بالکل نہ جھکی۔ بلکہ اس نے بھی اپنا ہاتھ ان کی کمر میں ڈال دیا۔ نئے میاں جیسے ہوا پر اثر ہے تھے۔ ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ چائی کی لٹو یا دودھ پینے میں لگی تھی۔

"مجھے تم سے پریم ہے۔" انہوں نے جیسے سوتے میں کہا۔

"ہاں تم مجھے چائی جگھتے ہو۔ پر شتم سے دوسری پریم کرتی ہوئی۔"

نئے میاں کو کھانا ہوا دل جیسے ظہر کر برتن گوش ہو گیا۔ شاید اب وہ کہے گی۔ "ایسا پریم جو ختی کے باپ کو بھی نصیب نہیں۔"

چائی اپنے ہاتھوں پر زبان بچھ کر کہنے لگی۔

"جگھو ان جانتا ہے نئے میاں انہیں دیکھ کر مجھے اپنا پہلو کی کا لڑکا یاد آتا ہے۔ جیسا کہ تو ابھی بڑا ہوتا۔ مگر کاہے کو میری یہ کت

ہوتی۔ آج کو میں راج کرتی ہوئی۔" چائی کی آواز آنسوؤں کے سلاب میں بہہ گئی اور نئے میاں ہوا پر اڑتے اڑتے دم سے دشمن

پر آ گئے۔ ان کا ہاتھ چائی کے گردن میں جھول رہا تھا اور انہیں چائی کی گرفت اپنی کمر کے گردت معلوم ہو رہی تھی۔



”کیوں؟“ وہوں نے چڑ کر کے اہل گھر سے سوال کیا۔

پکا بات کہنے ڈر لگا۔ کیونکہ بچ بولنے کے سلسلے میں سوائے بد پرہیزی کے غصوں کے کچھ شائد نہ تھا۔ اس پر اس کا کھات کھٹے دھکی بھی دی جاتی اور پھر اس کا غصہ۔ ”تم بڑی شراب لاکو۔“ جس پر پکا ڈر بھی خیل نہیں۔ ”میں بھوت بولنے پر غل گئی۔“

”وود کیسے نا ڈر آج ایک بھاری سی کتاب فتح کرنے کا ارادہ ہے اور ڈر اس وقت صبح میں ہوں۔ قہور آگ لگنا کس کی بھی۔ اور ایک بات یہ بھی ہے کہ وود حاتی کھٹے تینا ہال میں بند نہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میری صحت پر برا اثر ہوگا۔ دوسرے میری آنکھیں۔ جیک بھی تو فوت گئی ہے۔“

میں نے ورد سے جواب ہو کر بچے بچے ہوئے بھوت کا طوطا باندھ دیا۔

”اوہ بڑی اچھی لڑکی ہو تم“ بھائی جان نے بیوقوف بننے میں چل کی۔

”اچھا تو روزانہ بند کرو۔ ہم ہمارے ہیں۔“ بھائی جان بھی صاف پیسے آگئیں۔

بھائی میں اطمینان سے میں نے اپنی بھاری کاسک مٹا کر شروع کیا۔ یا تو ابھی تک مارے ڈر کے منہ سے ہوں بھی نہ کی قسم یا اب۔

”اللہ ہا۔“ مجھے مارے تکلیف کے روئے آنے لگا۔ پورا کھانی کیا ہو گیا ہے مجھے؟ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ وہ سب اور بیٹھ فوٹک بھا کر کہہ دیتا ہے۔ ”کچھ نہیں کوئی بات نہیں۔ بس ڈر اس دوا کی دو چار شیشیاں پی لو انفرجین کھاؤ“ غور و فکر کرنا چھوڑ دو۔ بس ابھی ہو۔ ”غضب خدا کا اور جنوں ڈاکٹروں کی اور جنوں شیشیاں پی ڈاکٹر لیکن دو چار شیشیاں باقی ہی رہیں اور یہ جو بدیز کہتے ہیں ”کچھ نہیں“ تو پھر کھانی اور ورد کوئی تباہ نام ہو گا ان کی گفت میں۔ کسی کا کیا جائے گا جس میں کسی دن مر جاؤ گی۔ میں نے گفت کرنا چھوڑا۔ کچھ نام میں سمجھتی کیا اور پھر جی کھانی تو ہوش غالب لیکن فراموشی میں کسی کے ہاتھ کاس اپنی پیٹھ پر غموں کیا اور کھانی کے کھٹکوں کی لائی ہوئی پکا چاند کے باوجود میں نے دیکھا کہ ہی لڑکی مجھ پر بھی ہوئی ہے اور اس کے خشک سہیرے پاؤں کی کچھ نہیں کٹھوں سے اسٹیک کر میرے لاپہر معلوم ہی ہیں۔

”یہ لڑکی سوز پھٹکی کھری بدلتیز۔۔۔۔۔ نہیں بھی کچھ نہیں۔ ڈر انجیو ہے اور اپنی عمر سے زیادہ جلد۔۔۔۔۔ دینے تو کبھی اس نے بات نہ کی۔ لیکن دیکھو اس موقع پر اپنا بھی کوس کا منون ہو چلا۔ یہ جلد ہی نہیں تو دور کیا ہے؟“

میں اٹھنے لگی۔

”تم لیکن یہ نہیں تو پھر کھانی آنے لگی۔“ اس نے بڑی بے تعلقی سے کہا۔ اور پیار سے میری بھری ہوئی ٹیبل درست کرنے لگی۔

”تم“ یہ طرز خطاب مجھے کھانا خیر!

”کیا تیار ہے تمہیں؟“ اس نے غور سے ہو کر پچھا۔

”کچھ نہیں“

”ای“ یا علیہ وجہ تھا۔

”میری بھاری کا نام ڈاکٹروں نے بھی بتا دیا ہے۔“ میں نے وضاحت کر دی۔ اس کا قہر سکر اہٹ میں تبدیل ہو گیا اور اس نے اپنی بڑی بڑی لیکن بے کیف سی آنکھیں کھانچا کر ڈاکٹروں کی حماقت کے کئی کچھ مجھے سنا ڈالے۔ اب میرے دور کو بھی خیر آ رہی تھی۔ اس لیے اصرار کی سوتیلی گئی۔

”کیا نام ہے تمہارا اور یہاں کس کے ساتھ ہو؟“ میں نے پورا سوال کیا۔

”زریچہ۔۔۔۔۔ اپنے ابا کے ساتھ ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارے ابا جی نہیں بہت چاہتے ہوں گے۔“ میں بچوں سے یہ سوال آنکڑ کرتی ہوں۔ بلا مشغولی تو۔

”اوس“ بھگت۔ ”وہ بھوت لگا کر خانا میں کچھ گھورنے لگی۔“ وہ تو ہمیں جانے کے مارے لال لال ہواؤں وہی تمہارے برہنہ لڑکیوں کو چاہتے ہیں۔ خیر! جب ہم بھی اتنے ہی بڑے ہو جائیں گے تو دیکھیں کس کیسے نہیں چاہتے۔“ میں کٹ کر رہ گئی۔

”تمہاری اماں کہاں ہیں؟“ میں نے اسے خاموشی کچھ کر سوال کیا۔

”مر گئی وہ۔“ اس نے اس طرح کہا جیسے اس کو اماں کے مرنے پر خفا رہا ہو اور میں پریشان ہو گئی۔ خواجہ اور نجیبہ کہہ دیا بھاری کو میں نے اب بھلا دیں۔

”بھئی بڑی اچھی لڑکی ہو تم کہاں ہیں اب کبلی مر چہ آئی ہو؟“

”نہیں ہم بیٹھ کر میوں میں یہاں آ جاتے ہیں۔“ وہ میری اٹھیں سے کیٹنے لگی۔

”تمہاری اٹھیاں بہت اچھی ہیں۔ بھوئی بھوئی جی نہیں۔“ اس نے میری اٹھیاں اپنے ہاتھوں میں سمجھتی نہیں اور نہ ہی۔ اس

تو جہل اس کے میری اس کی بچی دوستی ہو گئی۔ وہ تقریباً تمام دن میرے پاس ٹھہری رہتی۔ نہ جانے اسے کتنی باتیں کرنا آتیں۔ بس قطعاً تو بھول کر دیتی اور بعض بعض باتیں تو اتنی جیب تک نہ جاتی کہ میں مسد کچھ کر دیتی۔ وہ تو کچھ اپنی عمر سے زیادہ سوچتی اور باتیں اور سمجھتی ہوتی لیکن۔ لیکن میں اس کے احاطہ میں نہ ٹوٹ گئی نہ پاتی۔ کیونکہ وہ تو بے بات کی بات پر رنجیدہ ہو جاتا کرتی۔ دوسرے وہ مجھے چاہتی تھی اتنا جی کہ میرا منہ نہ پکڑتا کچھ کہنے کو۔ ایسا روز روز کر میرا سب کام کرتی کہ کوئی وہ کچھ کا کام بھی نہ کرے۔ بس ہر وقت میرا منہ دیکھا کرتی کہ کہیں میں ناراض تو نہیں ہوں اس سے۔ ہم دونوں اکڑ ساتھ ہی چل قادی کو کھل جاتے تو وہ راستے بھرا میں کھری بٹی رہتی کہ میں قدم قدم پر یہی سوچتی کرتا تھا اس سے کہہ دوں کہ میری تمہاری دوستی ختم۔

”تم ادھر ادھر نہ کیا کرو۔“ وہ کہتی۔

”کیوں؟“ میں چل جاتی۔

”لوگ حسیں سمجھتے ہیں۔“

”تو میرے ادھر ادھر نہ کیجئے سے لوگ سمجھنا چھوڑ دیں گے کیوں؟“

”میں نہ مگر تم تو نہیں معلوم ہو گا کہ لوگ حسیں دیکھ رہے ہیں۔“ وہ جواب دیتی اور مجھے ایسا لگتا کہ کسی نے مجھ پر گرم گرم بھول اندھیل دی۔ جی میں آ جا کہ مارے قہقروں کے منہ سرخ کر دوں بکھت کا۔ لیکن پھر وہی رعب۔ دل ہی دل میں اپنے بلا وجہ دہنے پر تاد کھاتی رہتی اور قہقرا کا حوا کر کر رہا ہوتا۔

”اب وہاں نہیں گے۔“ میں جیڑ رہا ہوں کہ کتنی اور میرے کھانسی طرح بھی میری نظریں اور بھی دیکھنے والوں کی نظریں دیکھتی سامنے کی طرح ساتھ رہتی۔ لیکن جاتے قیام پر پہنچی کہ اس کا کھرا این اس طرح لگاوت میں تبدیل ہو جاتا کہ میں دوستی ختم کرنے کا اعلان نہ کر پاتی۔

سچ سے سچی کچھ اس قدر۔ سمانی جان اپنی ہی جیسی سونی تازی پر اپنی دوست کے ساتھ پہاڑیوں پر چڑھنے کی مشق فرمائے گئی ہوئی حسیں اور بھائی جان تو قہقرا کر کے ہی کے خیال سے آئے ہوئے تھے۔ اب میں جی میں اور میرے کھینچے ہوئے خیالات۔ اسے میں وہ آ گئی۔

”چپ کیوں چلی ہو؟“

”جو بھی اس کا آجکل رہا تھا وقت۔“

”کھنسی کیوں نہیں کی آج؟“ اگلے جھوٹے ہوئے ہیں ہال۔“

کے کہنے پر جو میں نے اپنی انگلیاں دیکھیں تو مجھے بڑی سی اچھی لگیں میں بے ساختہ مسکرا دی۔

”اور تمہارا چہرہ بھی خوبصورت ہے۔“ اس نے اپنی گہری گہری آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں اور میں ڈرا دل لائی۔ جھوٹ بول رہی ہے کم بخت! ابھی ڈرا دیر پہلے میں نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی تھی تو کتنی بری لگتی تھی۔ صحت بھی تو راب ہے۔

”کی بات تو تم بڑی بھاری لگتی ہو مجھے۔“ اس نے میرے چہرے کو اپنی حسیں میں ہونے سے دبا لیا اور وہ بہت سنجیدہ ہو گئی۔ چہرے پر وہی کھرا یہی غم غمک کر سمجھنے لگا اور مجھے ہونے لگی۔

”تم خوش رہا کرو۔“ میں نے گھر دکر کہا۔“ مجھے بھی یہ چاہیے سے بڑی فکرت ہے۔“

”اچھا“ وہ اپنے چلے ہوئے کا ایک گوشہ پا کر مسکرائے لگی۔

”زری! اسے نہ بھلا۔“ یہ اس کے باپ کی آواز تھی جو اسے جیب انداز سے پکار رہا تھا۔

”اب تمہاری طبیعت تو ابھی ہے؟“ میں جھانک رہی تھی۔

”ہاں ہاں جانا تو تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔“ میں نے کہا۔

دھو دھو..... دھم دھم“ متصل کرے میں اس کا باپ نہ جانے کیا اظہار میری کر رہا تھا۔ روز رات کو یہی آواز دھم دھم ہوتا۔ اسی لیے تو بھائی جان ہوئی کے قیام سے کیا کر رہے تھے اور اس کا کام کر رہے تھے۔

”تمہارا بے ابا کا دھم کیوں کرتے ہیں؟“ میں نے لگے ہاتھوں پر جی چڑھ کر پوچھا تھا۔

”وہ جو اتنی ہی تھی بڑی لڑکیاں! وہ روز رات کو انہیں بہت سا شربت سونے میں ملا کر دیتی ہیں اور باکوا شربت بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لیے انہیں سب لپی جاتے ہیں اور جب ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو مارے خوشی کے بڑے بڑے حوسے کی حرکتیں کرتے ہیں۔ ایک دن تو انہوں نے ایک لڑکی کی ساری.....“

”زری! زری کی بچی! ساتھ ہی ایک بار ایک بھیکے کی آواز کو بھی اور وہ اپنی بات میری کئے بغیر بھڑکی سے بھاگ گئی۔

دوسرے دن میرے میرے کمرے میں وہ بھڑکی آئی۔ لیکن میں سو رہی تھی۔ اس لیے بھٹی گئی۔ یہ مجھے سمانی جان نے بڑی جرات سے بتا تھا تو میں نے انہیں اپنی اور اس کی دوستی کی ابتدا سنا دی۔

”ہاں وہی تو میں کہوں“ سمانی جان نے اطمینان کی سانس لینے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے کمرے کے سامنے سے گزری تو میں نے اسے بلایا۔ بڑی دیر تک چلی باتیں کرتی رہی۔ اس کے بعد

اس نے اپنی انگلیاں میرے ہاتھوں میں الجھا لیں۔

”کی نہیں چاہا۔“

تو لاڈ میں کروں کھنسی ”وہ جھپٹ کر گھبراہٹ میں سے نکلتا اٹھ اٹھی۔“

”نہیں بھئی مجھے لگتا رہے وہ۔ میری طبیعت نہیں ابھی اس وقت۔“ جی جی جان اٹھ سی رہی تھی۔

”تم ٹیلی ریمیں کروں کی کھنسی۔“ وہ بڑی خوشامد سے بولی اور میری چہنچاں کھلنے لگی۔

”ارے؟“ میں نے گھڑی لے کر اپنے بازو دیکھ کر۔

”کیا؟“ اس نے اپنی ہتھی سی زرد گردن کو کندھے کی طرف جھکا کر کہا اور مسکراتے ہوئے ہر جگہ یوں کو بھیج کر تھوک نکلا۔

اب وہ احتیاط سے چہنچاں کھول رہی تھیں۔

مجھے اپنی ”ارے“ پر بڑی اظہت ہوئی۔

وہ آہستہ آہستہ میری ٹوں میں کھٹکھٹا پھیرنے لگی اور میری آنکھیں سرور سے بند ہونے لگیں۔ یہ بھی میری جیب حادث ہے کہ جہاں کسی نے میرے ہاتھوں کو پھرا اور مجھے خیر آئی۔ اس کا ہاتھ کھنسی کرتے کرتے رکھا اور میرے چہرے پر ہلنے لگا اور پھر اچانک میں نے اس کی ہتھی ہوئی سانس اپنے چہرے پر اور پٹنے ہوئے ہونٹ اپنے ہونٹوں پر محسوس کئے۔ میرے منہ سے جسم کی رگوں میں چنگار یں سی کھلا گئیں اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

”تم مجھے ہاتھ ابھی لگتی ہو۔“ اس نے میرے چہرے کو اپنی چٹکی ہوئی انگلیوں میں زور سے پھینچا اور میں بلیسر سوچے سمجھے اپنے اوپر بے زور لگنے لگی۔

”تم جیساں کہ بکھر رہی زری؟“ میرا کی چاہا کہ وہ مجھ سے بھی کیسی جدا نہ ہو۔ جب تک تم رہو گی۔ تمہارے بلیسر یہاں میرا ہی گھبرانے کا۔“ وہ اپنے خشک ہونٹ کی ایک چوڑی دانت سے دبا دبا کر ادا پڑنے لگی۔

”تمہارے ہاتھ تو بہت ہی اڑکیاں آتی ہیں۔ ان سے دوستی کرو پھر میری تمہارا ہے گا۔“ میں نے یونی کہہ دیا۔

”اوں ہنک! وہ سب کی سب بڑی تک چڑھی ہیں۔ اس وہ سب تو ہمارے پاس گھس گھس کر بیٹھتی ہیں اور۔“ اس کے چہرے پر سے کھلیں صاف کھرچ نکلیا۔

”بھئی دوسری باتیں کرو۔“ میں نے گھبرا کر بات کاٹی۔ وہ ہنس چڑی۔ ہاتھ اس طرح جیسے کوئی کسی نے کہ ”جو جو“ سے ڈرا کر

خوش ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ان سہیلیوں کا ذکر کرنے لگی۔ جن سے وہ بہت محبت کیا کرتی تھی۔ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں اور چہرہ ہاتھ جیب ہو گیا کہ مجھے دشت ہونے لگی۔

”لاڈ کھٹکھٹے دو میں ہاتھ ایک کر لوں تم تو باتوں میں لگ گئیں۔ میں نے اسے دوسری طرف متوجہ کر لیا اور وہ اپنی سہیلیوں کو بھولی کر میرے ہاتھوں سے الجھتی۔

اس کے بعد سے تو ہاس کا سمول ہو کر وہ گیا کہ کھٹوں میرے ہاتھ سنوارا کرتی۔ ابھی اپنی مرضی کے ہاتھ بنائے اور وہ کھڑے ہو کر ہر زور سے سے صحت کا کیا اور نو۔

”اس سے اچھے بھائی کی۔“ پھر ہاتھ ہانے لگتے ہاتھ۔ ایک دن تو اس نے فطرتی کر دیا یعنی ایک چہرہ اسٹ فٹنی سے اڑا دی اور ننھے ننھے ترشے ہوئے ہاتھ بھری طرح پیشانی پر بکھیر کر خوب سی خوش ہوئی۔ میں جب ناراض ہوئی۔ تو اس نے لپٹ کر تنگواں بیکار ڈالے۔ یہاں تک کہ میرا دم گھٹنے لگا۔

”بھائی! میں نے آٹا کرا سے لگ کرنا چاہا۔“

”اوں۔۔۔۔۔ اوں۔۔۔۔۔“ میں نے اسے اس کا سے لگ کرنا چاہا۔ ”اوں۔۔۔۔۔“ میں نے اسے اس کا سے لگ کرنا چاہا۔ ”اوں۔۔۔۔۔“ میں نے اسے اس کا سے لگ کرنا چاہا۔ ”اوں۔۔۔۔۔“ میں نے اسے اس کا سے لگ کرنا چاہا۔

”جی جی“ میں مارے چہنچائی کے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اب وہ مجھ سے ناراض ہو جانے کی۔ کتنی دلیل ہوں میں بھی کہ اس کی محبت کا یہ صلہ دیا۔

میں نے اڑتے اڑتے نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ دبا دبا سے لگی مجھے جیب جیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ بڑی جیب سی نظروں سے۔ کیا باتوں کو جس قسم کی نظر میں تھیں۔ اس کی ہتھی پٹنے پہنچی ہوئی تھی اور خشک سہری ہاتھ صحت سے لے کر بیٹھے تک بکھیرے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ بالکل کسی جڑ شیلے کو جان کی طرح حرکت اور دشت زور ہو رہا تھا۔ میں جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

”سنو! وہ بڑے رعب سے کہتی ہوئی بڑھی۔“ اب ایسا بھی صحت کرنا۔ اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری کمرے گرد لپیٹ کر اپنا سر میرے سینے پر جھکا لیا۔ میں کس قدر غصے میں تھی وہ حرکت کھڑی رہی۔ میرا کی چہرہ ہاتھ کا اس کا سر وارہ دبا دبا سے کھرا دوں۔ آخر یہ مجھ پر رعب کا ننھے دلی ہوئی کون ہے۔ لیکن اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی گرم رقبہ چڑ میرے سینے





راکھ

”یہ کھنڈا رہا“ رقی نے سریت کا ہاتھ چھو کر کہا۔

”اری ای کیاں سے آئی تو؟“ میں کھل گئی۔ سریت اور اے موقع پر جبکہ چار پانچ ہم عمر اور ہم مذاق لڑکیاں اٹھیں ہوں۔

بڑا اداوتی ہے اور وہ دھکی چروں کی طرح چپ چپ کر بیٹھتی ہیں۔ کہہ بند کیا اور اسے سے ہلکے ہلکے دھواں اڑا دیا۔

”چوری کی ہے۔“ وہ کہے چروں کی سی ہلکی سی بولی۔ ”تمہارے بھائی جان باہر کے کمرے میں پڑے سو رہے تھے۔

انتخاب کا گڑا اور اسے ہوا۔ موقع دیکھ کر ہاتھ صاف کر دیا۔ کہہ کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”اچھا اور حلقہ تو دو۔“ کہیں میرے بھائی جان کی کوئی اور چیز تو نہیں اڑا لیں۔“ میں نے شرارنا اس کے ننھے ننھے ہاتھ مشبہلی سے پکڑ لیے۔

”مثلاً دل وغیرہ“ فریڈ نے اور سی سے خوشگلا اور رقی نے اپنے ہاتھ چھڑا کر اس کی بیچ پر جسم سے ایک ٹھوسا جڑو یا اور بھرا پاتا چرو اپنے بیٹنی طرف ہنسا کر اور آٹھکھیں چڑھا کر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی۔

”تم بکھڑا! اگر کوئی چوری کا اقبال کرے تو کھنڈہ ہمارے اخلاق کی بنیاد سے بھی واقف نہیں۔ اگر تم یہ سرکشی یہاں سب کے سامنے چھ کر بیٹھ کر لگو تو جاتی ہو کیا ہوگا؟ حالانکہ تقریباً کسی جانتے ہیں کہ ہماری شیطان چوڑی سریت جتنی ہے۔“

”کیا ہوگا بھلا؟“ شرس نے پوچھا۔

”تم سب کی سب ہمیشہ کے لیے کوہاری روہاؤ گی۔ یہ جتنی بہت سی عورتیں جنہوں نے برسوں سے تم لوگوں کی اماؤں کو اپنے ہاتھوں اور جنوں کے چھامہ سے رکھے ہیں۔ فوراً ہی تو وہ دو گنا ہوں پکڑا کر انہیں لے لیں گی۔ جہنم نہ ہو تو آزاد نہ کر دیکھ لو۔ میرے ہنکر کی“ (نکھر گئی) ”(اس کے نزدیک لڑکیاں کوئی اور لڑکے کو گھر سے ہوتے ہیں) اور اصل ہم سب چرو ہیں چرو۔ ہمیں ہمارا اخلاق چوری کی نصیب دیتا ہے۔ میں اپنی مثال ہی دیتی ہوں کہ میں روز رات کو کھڑا صاحب کو کھانکھان کرتی ہوں۔ امی جانتی ہیں لیکن روز چاہتی ہیں کہ کیا کھدھی ہو؟ جانتی ہو میں کیا جواب دیتی ہوں۔“ رقی کی سنجیدگی کمری ہو گئی۔

سمانی جان عزیز۔ اس نے میرے چروے کو اپنے چیلے ہوئے چروے سے داغ شروع کر دیا۔ لیکن ادھر سماتی جان عزیز اور ادھر وہ کھٹ سے سجی ہوئی تھی۔

”بھاری؟“ میرا دل ایک جھلکے سے ہلکوں سے جا لڑا۔ آخر یہ چوری کسی؟ میں نے اچھ کر اسے گھور دیا کہ اوپر کے ہونٹ پر پینہ چمک رہا تھا اور میرے ہاتھ پر رکھا ہوا ہاتھ کھینچ رہا تھا۔ وہ تو جیسے.....

”کسی ہے یہ بڑی؟“ کھٹ کھٹ داغ پر چوٹیں سی کھٹکے لگیں آٹھکھیں آپ ہی آپ ماند پڑ گئیں اور سماتی جان کی ایک ہلکی سی گھبراہٹ آج کل جتنے کے بعد مجھ پر ایک گلاب سا غلاب طاری ہو گیا۔

”کرشت و بنا چکا کروں جیسا پورے قافلے جان جسم کی نظر میں ہے رنگ چڑیا سے ہونٹ اور چیلے ہوئے ہاتھ۔“ میں کہنا پوری تھی۔ اسے لہو اور ایک کھرا چرو کھتے بہت سے چروں میں تبدیل ہو گیا۔ بالکل ایک جیسے سوکھے سوکھے بے دانتی چروے۔ افواہ یہ تو میرے چاروں طرف دایروں کی طرح جن گئے ہیں۔ اب کیا کروں؟ اور یہ نظر میں اتنی بہت سی ہے کیف آنکھوں سے نکل کر مجھے ہر طرف سے گوری ہیں۔ بھتیجی ہوا جاتا ہے سارا جسم۔ کہاں جاؤں؟ اور ہے؟ اب یہ پتے پتے چیلے ہوئے چیلے۔ آف کتنا کھرا ہے ان سے۔ اور یہ میری طرف بڑا کس لیے ہے ہیں؟ اور یہ بے رنگ ہونٹ ان کی جگہ نہیں بچتی کی۔ اب بڑے یہ ہاتھ اور مجھے دیکھنا اب بڑے یہ ہونٹ اور میرے جسم پر چیلے۔ مارے خوف کے میں تڑپتی تو آٹھ کھل گئی۔

کھٹ کھٹ..... کاک کا چنڈا دم اس گٹ پر مجھ سے جا رہا تھا۔ ”افواہ تو ایک ہی کہتا ہے رات کا۔“ میں نے سوچا۔ ”سماتی بھی سو رہی ہیں اور بھائی جان بھی۔ بھاروشنی کیوں کر دیکھی ہے اب کھٹ۔ کتنی قماش اور سرد رات ہے اور میری طبیعت بھی تو خراب ہے۔ جانے کیا ہو گیا تھا شام کو؟“ میں نے اپنا دھنکنا ہوا بھاری سر جھکے پر دھرا۔ مارے غصہ سے جسم لہو ہو رہا تھا۔

”سی سی“ میں نے سوچنا کہ اپنے سر ہانے نظر پھیری تو دیکھ میرا مثال اوڑھے کمری پر دو اکڑوں بھی سی سی ہے۔ سردی سے اس کے ہونٹ کپکپا کپکپا کر نکلے پڑ گئے تھے۔

”تم اس وقت یہاں؟“

”ہاں“ وہ مجھ پر ہلک کر بولی۔

اور جیسے مجھے کوئی لگتی۔



"کیا جواب دیتی ہو؟" ہم نے یکے زبان ہو کر احتیاط سے پوچھا۔ تو اس نے پہلے تو اپنا ٹیپا ہونٹ دانتوں کے دیا اور پھر ذہنی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

"وینیات پروف تھو کر رہی ہوں۔" اور ہم سب بے حاشا ہنس پڑیں۔

"اور بھی تو سنو! اسی پر جواب سن کر قطعی مطمئن ہو جاتی۔ حالانکہ وہی 'ٹوٹ' اس لحاظ سے بند میرے سر ہانے رکھے رہے ہیں۔ جس پر عزیز صاحب کا پتہ کھسا ہوتا ہے لیکن اسی پر روز مجھے بڑے عیار سے جگاتی ہیں اور میں کانٹے کے بعد گواہان کی نظر بچا کر اس لحاظ کو سمجھنے کے لیے چھپا لیتی ہوں۔"

"ہو گئی بدعاش! میں نے عیار سے کچھ لکھا کہا۔"

"دیکھنا سنی ڈاکلی... کہ جودی عزیز صاحب والی بات۔" رقیہ نے منہ بنا کر کہا اور ہم سب اپنے ہنچھڑوں کی پوری طاقت سے ہنس دیے۔ بالکل کھوکھلی فحشی۔ موضوع کے اچانک صبح جھانپنے سے ہم سب کے چہرے دکھاتے تھے۔ اور سرگرمی سے چپے کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا تھا۔ لیکن رقیہ نے سکرین کے اوپر کچھ کر بہت جلد میں بتا دیا۔ اب مسئلہ یہ نہ ہو رہا کہ آخر ہم سکرین کو کہاں چھپ کر اڑا دیا جائے۔ چنانچہ تقریب کا موقع تھا اور گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اگر کسی کی نظر پڑ جاتی تو ناموسی فحشی تھی ہوتی اور پھر میرے خاندان کی عورتیں تو ایسے میری تاک میں رہیں کہ سب اس کم بخت شاداں کی کوئی معمولی سی بات بگاڑیں اور ہر طرف مریخ کا گویا کے ذہنی چٹا کر دے کے لیے پیش کریں۔ جانے کیوں میں خصوصیت سے سب کی آنکھوں میں غار کی طرح چٹکتی میرا گناہ کہو تو اس اتنا تھا کہ جو کچھ دیکھتی، سنتی اور سمجھتی اسے نکلوں کی صورت میں ڈھال دیتی یا پھر چھپ چھپ کر سکرین چلتی۔ اور آگے آگے جیتی تھی۔

اب ہم نے ایک ایک کر کے تمام کمرے جھانکنا شروع کئے۔ ہر جگہ رنگ برنگے لہراتے ہوئے آنچل۔ میری روح کا تپتی ان جگے پھٹکنا لگیوں کے لیے بڑھتا ہے۔

"اے یہ کمرہ خالی ہے۔" میں نے غوطی سے چلا کر کہا۔

"انہی ہوئی ہو؟ اور وہ نکلوں صوفے میں کون دفن ہے؟" رقیہ نے مجھے کمرے میں اٹھا دے دیا اور میں اپنے پاؤں بڑھی۔

"اوں! اوں! آگہی جاؤ چیکے چیکے۔ آپڑی سواری ہیں۔ سب سے الگ تھلک۔"

دوبس کی سب اپنے پاؤں بالکل لیوں کی طرح کرے میں آ کر کرسیوں پر رنگ برنگے گھڑتوں کی طرح بیٹھ گئیں۔

"اب سکرین جلاؤ۔" شریانے ہمیں سے میرے کان میں اپنی گرم سانس اگل دی۔

"اچھا! اچھا! پتا کا کام شروع کر۔" میں تو اپنی سکرین جلائے لاتی ہوں۔"

میں ایک سکرین کے زبردستی کر کے کھینچنے لگی۔ کسی ایک کو بھی نہ جانے وہاں کی اپنی سکرین سے خوب بچوں گی۔"

"اور یو! اب کالے چٹا۔" شریا ڈانڈا کر پھٹک رہی۔

میں ادا دیتی خانے میں گھس گئی۔ گھوڑے سامنے چھوئے رعبوں کا ڈھیر لگا کر جسے جسم کے کھانوں کا حرا بھرا ہوا تھا۔

"ارے! گھڑا رادیا سلائی تو سدا۔" مجھے سکرین کی طلب بری طرح ہو رہی تھی۔

"وہ بھی بے طاقت پر چٹا!" اس نے ایک پلٹ چاٹ کر ہنک کر دینے کے بعد دوسری اپنے آگے سرکاتے ہوئے کہا۔ "کچھ کدو

آج تالی میں پھینکتے سے۔" میں نے کہا "میں ہی سوارت کر لوں۔" اور مجھے فحشی آگئی اس طرز پر لیکن جب طاقت سے دیا سلائی کی ڈیجا ادا کی تو حیرت آ گیا۔

"یعنی یہ خالی خولی ہے؟ سارا کچھ بے طاقت پر؟" فحشی چاہا کہ اس کے کھنکے ہوئے سر پر بے شمار چھتیں لگاؤں۔ "پوئے میں دیکھ آگ ہے۔"

"جیس ہے چٹا کھانا پکچے کے بعد میں نے سب اٹھا کر سب بھرا دیے تھے۔"

"ارے! کچھ تو کسی۔" مجھے خند ہو گئی۔

وہ بڑبڑاتا تھا۔

"راکھی راکھ ہے اس میں آگ کہاں؟ اسے لچھے۔" اس نے چپ سے اپنا کالا کر دھسے جیسا ہاتھ راکھ میں گھسیا دیا اور پھر جو

اچانک چٹکنا ڈکریچھے ہوتا تو اس کے کھنکے سے میں دیا اسے جالی۔

"الو گھڑا! میں نے فیصے میں اس کے لیے سے سے انکشاف شروع کر دیے۔"

"ہاتھ بھینچا کر دھڑکیا دینا" وہ اپنا راکھ میں اتا ہوا ہاتھ پانی میں ادا کر دینے لگا۔

"پھر تو کہہ چکے؟" میں نے اسے چڑایا۔ "راکھی راکھ ہے اس میں آگ کہاں۔ اور جب ہاتھ جھسا تو روتا ہے۔" اور میں بے

حاشا ہنسنے لگی۔

راکھ کے سینے پر ایک فحشی چٹکائی نے دم توڑتے ہوئے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور میں نے سکرین کا سراپا اس پر رکھ دیا پھر جو

دیکھ تو مری ہوئی پنکھاری نے اپنی روح میری سرایت میں غرق کر رکھی تھی۔ میں جلتی ہوئی سرایت کو دھپے میں چپا کر اس کمرے میں لٹائی گئی۔ جہاں سب وہ میری منتظر تھیں۔

”دراحدہ دھپے بند کر لو میری جان۔“ شمر نے بیٹھے بیٹھے حکم لگایا۔

”جی اب ہم سے کچھ نہ کہے گا۔ ہم اس وقت بڑا کام کر رہے آئے ہیں۔“ میں ایک صوفے پر گری۔ اچھلی اور پھر اسی میں جا کر رہ گئی۔

”دراحدہ تو کہو کہ ہماری شاعرہ کوئی قاتلہ یا ہنگامہ ساز تھی یا اپنے پیکیج میں چپا کر لائی گئی؟“ شمر نے میری سرایت سے اپنی سرگرمی جلاتے ہوئے پوچھے کہ کچھ بولیں۔

”ہم اس وقت یہ تجربہ کر رہے آئے ہیں کہ راکھ بیٹھ گھنٹی ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ درجہ کی اخلاق والی بات۔ اسے وہی کہ چپا چپا کر۔“ میری سانس بھول رہی تھی اور اس پر سرگرمی کا پکا پکڑا پتہ چلنے لگا تھا۔

”اور میری در یافت۔“ رقیہ نے آنکھیں ملکا کر کہا تو بطور رد وچ ایک زوردار قہقہہ۔ اس میری جان کل ہی تو مٹی کی تھیکے پا سوتے سے چمک پڑی تھیں۔

”اور احم لوگ؟“ اچھا سب کی سب ریل کا انجن بنی ہوئی ہو۔“ انہوں نے اپنے مخصوص پیکیج میں کہا اور پھر جلدی سے اپنا دوپٹہ سلپٹے سے اوڑھتے ہوئے سب کے کندھوں یا ٹیگوں میں لپٹے ہوئے وہ بڑوں کو لڑی نظر سے لکھا گویا یہ ہماری ہی ہے پتہ چٹ تھی۔ اچھا کوئی کہاں تک دوپٹے لپیٹے رہے ہر وقت۔ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں تو تھیں۔ میں نے اپنی ٹہلی لکڑی۔ مگر آ پانے جھڑکی پیدا کرنے کی قسم کھاتی تھی۔

”یہ کام مردانہ امت کا ہے کہ جی تو کوئی نہ۔“ یہ ہماری سرایت نوشی پر اعتراض تھا اور اب مجھے آئی بھٹھلا ہوا۔

”تو کہا تو پازر تائی تھیں کہ مخصوص ہوا کرتی ہیں؟“ میں بھی کہاں تک شہید کرتی۔ ”منت منت پر اس جو پانچ کمانی ہیں منظمی بھر بھر تباہ کو جہاں جان بچا گئی ہیں اور آپ جو کتنی بھر بھر جانے چڑھا جاتی ہیں تو شاید یہ سب سوچ کر کہ مردانہ چیزوں کو چھوڑنا اپنا مردانگی کی تو تھیں کہتے ہوئے؟“

”منت کارو نہیں۔“ سرگرمی تو نہیں ہے۔

ان کی اس باحصول سی بات پر شہ پھٹکنا کمرش پڑی۔ اب تو آ پا کوڑ کڑی لگ گیا اور وہ کمرے سے نکل گئیں۔ ہم سب کے

مذہب لگے اور سرگرمی کا دھماکا ہم جیسا کڑوا لگنے لگے تو یہ ہے بس۔ میں نے سوچا۔ اس کمرے میں زوردار بھی غرض نہیں رہ سکتے۔ لاکھوں بار میرے سرگرمی پتے پر اعتراض کر چکی تھیں۔ اگر اس وقت ان سب کے سامنے چپ رقیہ تو کون سا ساتھ ہو جاتا۔ مگر وہ تو بس شہ جانے کہاں رہتی ہیں۔ سب کا ہنسا جاتا انہیں زبردگت زبرد۔

”واقعی طور پر تمہاری آ پا بالکل بڑھی ہو گئی ہیں۔“ رقیہ نے مجھے ہرے سرگرمی بازوں کی طرح گل بھڑاتے ہوئے بٹے پر تنک چڑھا کر۔

”جی تو پیدا ہی بڑھی ہوئی تھیں۔“ سب ہنس رہے اور مجھے شمر اور شری آ پا میں یاد آ گئیں کہ ان کے پاس غلطو اٹھنے کوئی نہیں چاہتا۔ ایک یہ ہیں ہماری آ پا۔ وہ بچے کے گفن میں لپٹنا لپٹنا یا مردہ۔ ابھی بائیس سال کی عمر میں کھوسٹ پین کا یہ عالم ہے تو جب واقعی کھوسٹ ہوں گی تو کیا ہوں گی؟

میں بہت اس ہو گئی۔ جی چاہو رہا تھا کہ آج آپاسے خوب کس کے لڑائی کروں۔

”اوہو کیا بیاری نظم ہوئی ہے۔“ میں نے اپنی نظم عمل کر کے فیصلہ کیا اور پھر جراترا بہت سوار ہوئی تو چپا کر کسی کو سنائی جائے۔ سامنے ہی آ پا چمک پر لپٹی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ جی میں آئی کہ انہی کو ستا دوں مگر نہیں پایا۔ مجھے فوراً ہی اپنی ایک نظم کی گت بتنا یاد آ گئی۔ جبکہ انہوں نے اسے نہ کر کہا تھا کہ ”کیوں رہی؟“ جیسے مجھے پتہ نہ تھا کہ میں نے بتا دیا۔“ اور مجھے اس دن اپنے غلط ماحول میں پیدا ہونے کا شدید احساس ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس تجربے کا کل رقیہ سمجھ رہی تھیں۔ وہ کہیں کہ جب تک انسان پر کوئی بات پڑے نہ وہ دیکھ کر نہیں سکتا۔ اس حساب سے ہماری اصل اور اصل خود دھکار کر نکال دینے کی چیز یہی خبریں۔ اس بات پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی۔

سننے ہیں کہ کسی زمانے میں ہندوستان میں ایک بادشاہ تھا۔ بڑی عالم و فاضل بہترین شاعر۔ اس کی قلمی ایک یعنی۔ راجہ چاہتا تھا کہ اس کی جی بھی اس جی جی عالم و فاضل لکھے۔ اس لیے اس نے اپنی اپنی قلمیں دیتے پر ایک بہت سی قابل پندت کو مقرر کیا۔ مگر صاحب ارا بھگوار جی ویسے ہی ذہین چند سال میں انھیں اچھے عالموں کے کان کھرنے لگی۔ طبیعت پائی قلمی شاعرانہ علم سے سونے پر سہا کر گیا۔ بس بڑی گہری تھیں کہنے لگی۔ اتفاق کی بات کہ اس کی ایک نظم پر راجہ کی نظر پڑ گئی۔ وہ نظم قلمی زاد ہند تہمت میں رہتی تھی اور وہ تو آ غرض محبوب کی پر کیف اور لذت بھی حوسے میں بھونک رہی تھی۔ نظم دیکھ کر راجہ کا خون کھول گیا (شاہ بہگزار خون ہو گا) کاغذ میری کٹوری پائی لوٹ یا کو پندت نے نہ جانے کبھی نصیحت دی کہ وہ ان سب باتوں میں پکی ہو گئی۔ بس اسی وقت پندت

جہاز سے پرہیز کرنا ضروری تھا۔ کاکھم سے دیا۔ لیکن پھنٹ نے کہا کہ اسے راجہ میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے سردار پارٹیری ایک نظم لکھ لوں۔ راجہ قلم دوست اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کمزوری کا بھی ادراک تھا۔ جو عموماً شعراء میں راولگی کی ہوتی ہے۔ بات نہ ٹالی۔ دوسرے دن بارش میں اپنی نظم سنا شروع کی۔ اس میں کسی غریب کی مجھ پڑی کا ٹکڑا لکھا تھا۔ کیا تھا اور وہ بھی استعاروں میں۔ شکار کڑی نے چہرے پر جالان دیا تھا اور زمین پر پھلتی کے سوراخوں جیسے چھید ہو گئے تھے۔ ابھی نظم ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ پھنٹ نے اپنی چوٹی نوٹ کر پھاڑ دیا۔ "اے لوگو! یہ راجہ نہیں شور ہے شور اسے ٹالو یہاں سے۔" یہ سن کر سب حیران رہ گئے۔ لیکن راجہ نے اپنا طعنے خد کے چہرہ دیکھنے ہوئے کہا کہ اس کا کچھ تعلق کرو۔ کہنے لگا کہ تو خود کو پشت اور پشت کا راجہ کہتا ہے اور عمر جیڑی ٹھوس میں گزری تو تجھے کیسے معلوم ہو گیا کہ آگ نہ چلے تو چہرے پر کڑی جالان سن سکتی ہے؟ کیا ابھی حیرے بارہ جی خانے میں یہ کلیتہت پیدا ہوئی ہے اور تو نے دیکھنے کی زحمت کی ہے؟ اگر نہیں تو پھر تو راجہ بننے سے پہلے شور تھا۔

راجہ نے ٹکڑا کر صاف دیا۔ "یہ خوف پھنٹ تھیں بھی کئی چیز ہے؟"

تو پھنٹ نے اپنی چوٹی میں گردے کر کہا کہ تو کہتا ہے جس صرف حیرے سے میں آئی ہے۔ میری بیٹی کے نہیں؟

پھر راجہ کا چہرہ دیکھنا کھاری حلقہ میں تہل ہوا گیا۔

اسے تو یہ بات کہاں سے کہاں تک بتائی تھی۔ اس سوچ بچار کا براہ راستی دیکھا ہو کر وہ جاتا ہے۔ چاہتی تھی کہ نظم کی کوساؤں اور پڑ گئی کہانی دہرائے۔

"تو میرے ساتھ چاہیے؟" میں نے وہ اردو سنا۔ "جہاں جان تو دکھائی آ رہی ہے اور اس نظم میں شکار کا کوئی ذکر نہیں اس لیے وہ سن کر کیا کریں گے؟ غلام سوری ہیں تو پھر آپائیں وہی اس وقت قیمت ہیں۔"

"آپا؟" میں نے پکارا تو انہوں نے اپنا ہنسا سا چہرہ آہستہ سے میری طرف موڑا اور میری نہیں جہاز سے جوش کے ہلکا پھلکاری تھیں۔ کچھ کہہ سکیں۔ اندر کرے یہ خوش طبعی کی جڑا نہ دینا ہے۔" میں نے کپ کر دیا۔

"کہہ ان کے خوف سے سوراخ کی طرح وہاں سے اور پھر چپک گئے۔

"ایک نظم لکھی ہے۔" میں نے ہلک کر کہا۔

"اچھا، کتنی بھی ہوئی؟" اچھا، کتنی۔ میرا دل ہل گیا۔

"اختر کے لیے لکھی ہوئی؟" انہوں نے پچھا اور میرے سر میں گنگ تھیں۔ لاحقہ ولا..... یہ بھی عجیب محافت ہے کہ نظم لکھی

جانے تو کسی مخصوص ہستی کے لیے۔ میں کہتی ہوں کہ آپا نے اس وقت تو سارا پڑھا لکھا اور دیا ہے اور کوئی بات نہیں اور اصل یہ ہر وقت مجھے تپانے پر قلمی راقی ہیں۔ اور وہ اختر! وہ بڑا باطل فصول سا آدمی۔ چارلی چپلن کی نقیصہ نہ دیکھو اسے دیکھو۔ ابھی چند روز پہلے کی تو بات تھی کہ اس نے آپا سے میرے لیے منہ بسور بسور کر کہا تھا کہ تو کو کا کہا سلیو دے آ رہی ہیں۔ اس لیے وہ کسی کارڈ کا نہ پکا۔ اور نہ میری تو کڑ نہ ہوئی۔ نہ ہر کھلتی۔ خدا کی قسم اس کی سوجھوں سے تو مجھے گھن آتی۔ لیکن یہ آپا مجھے اپنے دل میں سمجھتی کیا ہیں؟ غریبوں میں اختر انہوں پر جان دیتی پھر ان؟ می چاہا کہ اس بات پر کس کے لڑاؤں میں سے۔ جب دیکھو جب انکس باتیں کہا کرتی ہیں۔ ایک گھر میں راقی ہیں تو پورا پالا پڑتا ہے۔ اور نہ تو ان کو سن ان کی ذہنی سلیو کی جانے کہ کب کا چھوڑ بیٹھتی۔

"وہ پڑا پڑا ہے ٹھیک ہے۔" اور میں مجھے میں بھری چندی۔ دوسرے طر کو کچھ کر لکھتی ہی فنی نہیں۔

"نظم نہیں سناؤ گی؟" ان کی آواز نے میرا تعاقب کیا۔

"جب تو ہاتھو جسم کی چیزیں نظم کروں گی تو دیکھا جانے گا۔" میں نے حکارت سے ان کی آواز کو دھکا دیا۔

اس روز میں بڑی دیر تک سوچتی رہی کہ آخر آپا کہنے کا کیا؟ کچھ نہیں؟ تاکہ یہ جیتی کیے بکری ہیں؟ جبکہ انہیں دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں۔ بھر فصول فصول نصیبیں فرمانے کے۔ سیتھانے سے پیا لٹائی ہیں۔ مٹھلوں میں ان کا دل گھبرا رہا ہے۔ سلیپیاں ان کی صرف دو ہیں جو مٹھلوں میں کھنڈے دیکھنے کے واسطے کسی ہاسٹول سے مٹھلوں پر بٹ کرنے آ جاتی ہیں۔ شکار آنکلی کی لڑکیوں کے دو پنڈوں کی پار کی اور مردوں کی ٹکا ہوں کا اتنی پٹنا۔ ایسے منہ بٹا بنا کر بڑے ہوں کے جیسے گھونٹ گھونٹ کو نہیں سمجھتی رہی ہوں۔ اور مرد تو جیسے ان کے خیال میں دھتک سے داخل ہونے کی چیز ہی نہیں۔ خدا کی بندی کو کبھی میں نے کسی اچھے سے اچھے مرد کو اچھا کہتے سنا ہی نہیں۔ بس ان کے دماغ میں "زبان عقل" کے خوف نے وہ جگہ حاصل کر لی تھی۔ جس کے بعد کبھی نہیں وہ چاہا انسان میں۔ بھڑکاؤ خدا کے۔

غیا۔ غیا۔۔۔۔۔ ہر طرف غیا۔۔۔۔۔ میں اپنی ساری پر کڑی بھول گئی۔ وہ مکلی مرتبہ ہی مجھے بہت اچھے لگے۔ انہیں دیکھتی کہ بس کھنڈتی ہی رہ جاتی اور کبھی کبھی تو پی چاہتے لگتا کہ ان کے بازوؤں میں دھتک چپا کر ہر طرف سے خبر ہو جاؤں اپنے آپ سے بھی۔ عجیب عجیب سے جذبات کھولنے کے میرے دل میں۔ بس جیسے غیا نے تو مجھے بالکل ہی چھو دیا تھا۔ دوسرے پڑوس میں آ کر کہا کہ بس مجھی میں آگئے۔ غیا۔۔۔۔۔ اچھے غیا۔۔۔۔۔ کبھی گانے گائے۔ اس ابا میری شادی کی گھر سے بے فکر ہو گئے۔ خاندان والوں کے پیٹ میں چہرے کو نے لگے کہ کچھ لکھا کم بخت چھاس لے گی جہاز سے غیا کو۔ اور پھر کیا تھا۔ ایسے ایسے الہ ربہ وہ ان اڑنے

لگے کہ مجھے حسرت ہوئے گی میں اپنی اور دنیا کی طرف سے اصلیت کا رنگ بھرنے کی۔ سہیلیاں بھی مجھے بھیڑیں گی۔" کیاں ری یہ کہا مگر کر دی ہے؟ تو کوئی قہر کہیں کسی سے مشتاق نہیں ہوگا۔ اب یہ کہہ مری مار پڑی؟" آپا کی سلیج کی اور نصیحتیں کھنڈ یادہ چمک گئیں ان دنوں۔

"آپا بیاری" ان دنوں مجھے ان پر صرف اس لیے دم آ میرا محبت آنے لگی تھی کہ میرے بچاے جانے کے بعد ان کی تنہی کی خرابی یہ وہ وہاں کی تھیں کہ کچھ بھرے نصیحتیں کسے کہا کر رہی گی؟

وہ سبز پر چت پڑی تھیں۔ میں ان پر جھک گئی اور سریت کا ایک طویل کش لے کر دو میں کا کمر ادا دل ان کے چہرے پر پھیلا دیا اور وہ کپکا کپکا کر سٹ گئیں۔

"اوں بونہ" بھئی "انہوں نے ہاتھ سے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔" ہائل مرد معلوم ہوتی ہو یوں" وہ مسکرائیں۔ اور ان کی بے کیلک آنکھوں میں چنگاریاں سی جبرے گئیں۔

انورہ کو باپ اس مرد سے نے بھی سانس لینا شروع کر دی۔ میں نے سچا اور اس خراب میں کہہ ڈالا۔ جی چاہتا ہے کہ اب آپ کی شادی بچا لیں۔

"نکست" ان کے چہرے کی شفاف جلد کے نیچے جیسے ایک دہری راگ کی کڑی تھیں جھگڑ گئیں اور مجھے ایسا لگا کہ ان کی آنکھوں میں جھری ہوئی چنگاریاں راگ کا گل کر رہیں۔ بس اس وقت میرا ایمان ہو گیا کہ آپاں دنیا کی چیز نہیں ہیں۔

"تو بھرنے بیٹھا کدوت ہو گیا ہے۔ سب تیار بیٹھے ہیں۔" انہوں نے نہیں باز دوس سے بکڑ کر چھوڑ ڈالا۔

"بھئی تم جانتی ہو کہ مجھے فلم دیکھنے سے رازا بھی دلچسپی نہیں وہی عشق و محبت کی بیوہ داتا نہیں۔" بھئی... ان کا چہرہ صوب دستور

چمکا ہو گیا۔

"تو بھر میں بھی نہ جاناں گی۔" میں نے واقعی رنجیدہ ہو کر منہ چلا لیا۔

"جہاز بھئی... کہہ تو رہی ہوں۔ اور آج عزیزہ ملے آ رہی ہے مجھ سے۔" انہوں نے کچھ جانتی ہے رہی برتی کہ مجھے اپنے اصرار پر تازہ آگیا اور میں کب کسب کے ساتھ بیٹھا چلی گئی۔

لیکن وہاں ہی نہ لگا۔ کچھ تو یہ خیال کہ میں بھی کتنی بری ہوں جو انہیں تھا چھوڑ آئی۔ میرا ان کا ساتھ کب تک؟ اگر آج ان کی خاطر نہ آتی تو کیا حرج تھا؟ رہی ان کی بے رہی تو یہ ان کی ہمیشہ کی عادت ہے۔ دوسرے فلم بھی کھائے غیر دلچسپ تھی۔ وہ لگے تک وہاں

بڑے کر معلوم ہوا کہ میں اپنے آپ پر سخت غم کر رہی ہوں۔

"اماں میں تو کھر جاری ہوں آپا کی گھبراہی ہوں گی۔" میں نے ان سے پچکے سے کہا۔

"اے جلاؤ" نے لگی آپا کی "ساتا" برداشت تو لڑا کرتی ہے اس سے۔" میں ان کا گھبرے سے طیراں سے لگل آئی۔

آپا اس وقت مجھے دیکھ کر بے قرار دل میں خوش ہوں گی۔ منہ سے تو نہ کہیں گی۔ کیونکہ ان کے خیال سے ہوں انسان بکا ہوا ہے۔ لیکن میری محبت کا جتن ضرور کریں گی کہ یہ گھبراہی میری تہائی کے خیال سے طر چھوڑ کر بیل آئی۔ میں سوچی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

"ان کی عزیزہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" آپا کے کمرے میں روشنی دیکھ کر خیال آیا۔

"بھلا اس وقت رازا دوں کو۔ دونوں بیٹھی ہوں گی نصیحتیں کی طرح" سوچی مجھے دور کی تھی۔ میں نے صورت حال دیکھنے کے لیے باغ پاس کا کر فیشے سے اُتار دیا۔

"آپا؟ آپا کسی مرد کو جس کی پشت میری طرف تھی کوئی لمبی لمبی نہیں میں بیٹھے ہوئے تھیں۔

"میں تمہارے بغیر کیسے جوں گی؟ تازہ؟" وہ بار بار کہہ رہی تھیں اور ان کی بھئی کھلی آنکھیں جانے کیسی ہوئی جاری تھیں۔ جیسے وہ خود مرنے کے کھانے اپنے پیارے کو کھا جانے کی سوچ رہی ہوں۔ ان کی آنکھیں تو کچھ کیسی کبہ رہی تھیں۔ میرے جسم میں مارے حیرت کے کایک لمبی دوڑ لگی اور انہوں نے جیسے ریت آگئی۔ میں اپنا توازن نہ سنبھال سکی اور میری سینڈل کی پک بکلی باغ پاس فرش پر چلی گئیں۔ میں مردہ سے بڑے قریب ابھیرے میں ٹھک گئی۔ اور میں نے اپنی لکڑی آنکھوں کرتے ہوئے سچا۔ آپا راگھ نہیں بھول لیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو روشنی برآمد سے لے کر آگن تک ایک جھلکائی ہوئی سڑک کی طرح کچھ گئی اور بھر میں نے ڈسپنے کے پاس سٹ کر اپنی جلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ آپا کے پیارے میرے منہ پر ہیں۔

اچانک جیسے زور دار آگئی اور جھلکی ہوئی چنگاریاں سے بھی ہوئی بھول بھی ہوا نہ سما گئی۔

بارہی خانے میں کھنڈ جانے کی بات پر اپنی بھیا یک آواز میں ڈنسا اور میں پتا سر بکڑ کر نہی گئی۔



”کہاں تھے آپ؟ میرا دل اکیلے میں گھبرا رہا تھا۔“ اس نے کھایت کی تو جیسے اس کے مقل میں آنسوؤں کا ذخیرہ دھارہ دھارہ پھس گیا اور آنکھیں میچے نکلیں۔

”ذرا کام سے کیا تھا۔ چراغ نہیں بجایا؟“ باپ نے چارپائی کے پاؤں سے ٹھوکر کھائی تو جھلا کر چو جھلا اور پھر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”دیا سلائی نہیں جلی۔“

”یہ دیا سلائی۔“ باپ نے جب سے دیا سلائی نکال کر ایک بڑی سلائی تو دیا سلائی کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا اوشٹ زدو سا نظر آیا۔ ابھی ہوئی کھڑی ازلی ہونٹوں پر اندھس ہوئی سوچیں نکیروں سے پٹی ہوئی پیشانی اور ابلی ہوئی آنکھیں۔ نکل پل کر ایک نئی سرخ رنگان کی طرح ٹھکرائی اور چہرہ پٹی ہوئی بیڑی کا دھواں چھوٹے سے آنکھن میں پھیل گیا۔

”اوں ہوں۔“ دھواں نکلتی ہوئی پٹی پر زدو سے کرکھ نکلی۔ بڑی کے دھوئیں سے اس کا پی سکارا تھا۔

”کیسا پی سا چمن؟“ باپ نے بیڑی کا ایک طویل کش لیا تو بجلی سرخ روشنی میں اس کی ابلی ہوئی آنکھیں چمک گئیں۔

”بیڑی نہ بجایا اس کے دھوئیں سے میرا پی اٹتا ہے۔“ اور وہ اپنے بخار سے بھاری سر کو کندھوں پر جھکا جھکا کر بیڑی سے کاٹنے لگی۔

باپ کو طعنا کیا کتنی دیر بعد تو اس نے بیڑی سلائی جلی۔ جب سے بیڑی کا بڈل چھ پچھ کا ہو گیا تھا۔ وہ تمام دن اور رات میں صرف چار بیڑی چلا۔ بارے طلب کے بھائیوں پر بھائیوں آئیں۔ لیکن اپنا پی مارتا اور اس وقت جینی سے عزم کا دیا کرتا تھا۔

”خیراتی تو ہر بات میں اس کا کرتا ہے۔ کچھ چراغ چل گیا ہے تو آ؟“ باپ نے آواز میں کہا اور اچھن بھیرے جھک جواب دیے اٹھی اور دیا سلائی کی آہ سے لے کر دالان میں جا چک گئی۔

کھرکی سستان چار بج گئی میں دیا سلائی کے گزرنے کی آواز کو فنی اور سیاہ طاق میں دیکھے ہوئے چراغ پر دم می لو پھٹنے لگی۔ بسیدہ دالان کے ستون کا سایہ چھوٹے سے آنکھن سے گزر کر سامنے کی دیوار تک چھ گیا تو اچھن سے دیا سلائی کی آہ سے فنی میں دیا کرنا پتا سر طاق کے برابر کھک دیا اور پتلیاں پھرا کر چراغ کی فٹلائی ہوئی کو کو پھٹنے لگی۔

باپ نے بیڑی کا سر چارپائی کی پٹی پر رکھ کر بھاد بھاد سے دھارہ دھارہ پھٹنے کے خیال سے اپنے کان پر بھرا کر اچھن کی طرف دیکھا تو اسے جیسے دھکا سا لگا۔ اندھیرے میں پتا دھوڑتی ہوئی روشنی میں اس طرح کھڑی ہوئی بڑی بویا تک لگ رہی تھی۔ ہڈیوں پر

## چراغ کی لو

شام کی بڑھتی ہوئی اور تاریکی میں سامنے کی ہریچ آہستہ آہستہ حدلی پڑتی جا رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر کھسوری اٹھوں سے لٹی ہوئی بھیرے بھڑکی دیواروں کو دیکھنا شروع کیا جتنا دھیرے سے ڈوب کر بویا تک ہوئی چلی جا رہی تھی جیسے وہ بیا رنگ میں نہا گئی ہوں۔ اندھیرا اور کھائی اس کا پی اٹھنے لگا تو کھانسی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے باپ کا اٹھنا تھا جو کام پر سے آ کر جانے کہاں چلا جاتا تھا۔

”نہ جانے کہاں بیٹھ رہے آیا؟ یہ غیال نہیں آتا کہ اکیلے گھر میں جی گھبرا آتا ہو گا میرا۔“ دھچھٹلا ہٹ میں زدو کرکس میں سوچ رہی تھی۔ اس کا پی چادر ہاتھ کر زدو زدو سے روٹنے لگیں۔ لیکن آنسوؤں کا ذخیرہ جیسے مقل میں اکٹ کر رہ گیا تھا۔ اس سے رو بیا بھی نہ گیا۔

اس نے دو بارہ اٹھ کر دھواں دیکھنا شروع کیا تو ہر طرف بس یوں نظر آئے گے جیسے سلیف کپڑوں میں لینے ہوئے دھواں چھ سامنے کی اندھیری کھڑی سے نکل کر سارے گھر میں کھوم پھر رہے ہیں۔ اس کے ذہن پر ان دھواں کی ہڈیوں کی قچ اور سلیف کپڑوں کی دم کھڑکھڑاہٹ اس طرح چھائی کہ وہ آنکھیں کھلی کر دو بارہ چارپائی پر بلا ٹھک گئی۔ بالکل بے حس حرکت جیسے اس کام ی کل گیا ہو۔ سلیف کپڑوں میں لینے ہوئے دھواں کی ہڈیوں کی قچ اور کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ یہ تو بس اس کا دم ہی وہم تھا۔ کچھ دنوں سے جسم کے ساتھ ساتھ اس کا چراغ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ رات تو خیر رات ہی تھی۔ وہ دن دو پہر بھی اکٹلا کر دم کرتی۔ بس دھیر بھی نظر بھرا کھنسی بھی لگتا کہ کوئی سلیف سلیف کپڑوں میں لپٹا چلا آ رہا ہے۔ بالکل اسی وضع کے کپڑے جس کی اس کو کھرنے کے بعد پھٹاے گئے تھے۔

دو دنہ دو دنوں طریقے سے چرچا بڑا اور پھر کھٹ سے بند ہو گیا اور اس نے کچپا کر آنکھیں کھول دیں۔ جب کچھ نظر پڑا تو مری ہوئی آواز میں بولی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں اچھن۔“ پیاس کے باپ کی آواز تھی۔

مذہبی ہوئی یا وہ کمال لکھے، لکھے یا بے ہال کھلے ہوئے ہونٹ اور بھری ہوئی تہاں۔ بس جیسے وہ دھار سے تک کر سرنگی ہو۔  
 اگلی دوسرا ہی سال تو تھا کہ باپ نے انجمن کی ماں کو باگل اگلی حالت میں بستر پر پڑے دیکھا تھا۔ کھلے ہوئے ہونٹ اور بھری  
 ہوئی پتلیاں۔ یہ دیکھ کر وہ بھانے رونے دھونے کے گزروں سے کپڑے کے بھیر میں پڑ گیا۔ جھجھوڑ گھڑوں پر پڑا اور غریب  
 عورت کا بچکان جسم۔ اسے دنیا کے قانون کے بموجب کفن چاہیے تھا۔ گزروں یا قانون پر اسے اترا ہوا کپڑا۔ چاہیے وہ زندگی میں ایک  
 عرصے سے چھائیں کے ایک گھیر گھار والے پاجامے کو ترستی ہی رہی ہو۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ غریبوں کو امیروں کی برابری کرنے کا  
 بس ایک ہی موضوع ملتا ہے دنیا میں اور دوسرے کے بعد صرف کفن لینے کے بارے میں۔ آپ اصل بات تو یہ ہے کہ غریب پیدا ہی  
 اس لیے ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد امیروں کی برابری کر لیں۔ تو انجمن کی ماں کے لیے بھی کفن چاہیے تھا اور اس کے لیے انجمن کا  
 باپ انتہائی لگن نہ تھا۔ دوسری رہا تھا کہ اگر انجمن کی ماں زندگی میں ہر ایک کے سامنے لیے لیے کپڑوں میں بھرتی تھی تو اس کا یہ  
 مطلب تمیزی تھا کہ وہ قبر میں بھی جی لگی کھلی رکھ دی جاتی؟ وہاں جہاں فرشتے جواب سوال کرنے آتے ہیں۔ بھلا وہ فرشتے کس  
 طرح اس تک دھڑک عورت کی قبر پر ظہر سکتے ہیں۔ بس اسی لیے اس نے جان بچکان والوں کے دروازے ٹھکنے۔ دھڑا دھڑا  
 بہت دوا دوا چلا رہا لیکن کہیں سے بھی اسے رو پکا دکھام نہ ہو سکا کہ کفن خریدنا چاہا سکا۔ انتظام ہوتا بھی تو کیسے؟ اس کی جان بچکان والے  
 ہی کوں سے وہ دولت پیسہ بھر کمانے والوں میں سے تھے؟ آخر وہ سب کی طرف سے دھمک بھرا پانے مالک کے پاس گیا جن کی  
 دکان پر وہ اس دن روپے پچیس کے عوض سے شام کو مساب کتاب لکھا کر رہا تھا۔

اس نے اپنی ابھی ہوئی ٹیلی داڑھی کو آنسوؤں سے بھرا کر ہاتھ جڑتے ہوئے کہا کہ مالک میرے گھر میں بازو رکھنے کی لاش  
 پڑی ہے کچھ قرض..... اور مالک نے بات کاٹ کر نرم لہجے میں جواب دیا۔ "مفتی جی! یہ اللہ کے مکر کا کام ہے" قرض نہیں تو یہ  
 روپے ادا کرنے کی گھر نہ کرنا۔ "آج مالک نے مجھ کو روپے دکان کے دوسرے ہاتھوں کو دکھائے ہوئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔  
 اس خیال سے کہ اللہ جہاں کے گھر اس کے بدلے رُوب ملے گا۔ اللہ دی تجارت اس واسطے سے اور دوزخ کی بات تھی کہ اس نے  
 انیس مالک سے اور روپے پانچ سو تھوڑے سے لے لیے۔ مالک نے انجمن کی ماں کو شکیم صاحب کا کھنڈا ہاتھوں پائے لیکن مالک  
 نے اس بری طرح بھڑک دیا تھا کہ وہ کسی کے زخمہ دہرے کھینکے کا ٹھیکہ انہیں اور اب موت کے کام پر آگئے تھیں روپے۔ انوارہ فرجیاں  
 کو کفن دینے سے کتنے فرخاند تھے اور کتنا اچھا اصول تھا ان کا کہ کفن لے لو اور موت لو۔ کیونکہ وہ تو دنیا میں ہی مسلم ہو جاتی ہے اور  
 کفن تو قیامت تک کے لیے لاش کی دلیل ہوتا ہے۔

روح کو ترستی کپڑے کو بھٹی اور شکیم صاحب کا نوپے کو سسکتی ہوئی انجمن کی ماں ایک دم انجمن روپے کا کفن مکن کر زمین میں  
 جا چکی۔

"اور اب.... اب انجمن" باپ کی فکر مند آنکھوں سے انجمن کو تک رہا تھا جو اب تک بالکل بے حس حرکت دیا رہے سرچے  
 چراغ کی دھم کو کو پتلیاں بھرائے کنگھاری تھی۔

ماں کے مرنے کے بعد سے اسے بھی نہ جانے کیا ہوتا رہا تھا۔ بس بھٹی ہی بھٹی جاری تھی۔ وہی ماں کی سی ہٹے دار کاشی اور ہلکا  
 ہلکا کنار۔ اصر پڑی ہے دھڑ پڑی ہے۔ باپ غریب اس کی حالت کو ٹھٹھا تو خوب مگر درد اعلان کیا خاک کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وہی  
 خیراتی اسپتال کی دوا دیکھیں جن میں لڑائی شروع ہونے کے بعد سے وہ انورائے نامی ہاں پانی ہی پانی پانی ہوتا۔ سرکاری اسپتال میں دی  
 جانے والی دوا دیکھیں سرکاری دہ بے کا خیال نہ کرتے ہوئے اننا نقصان ہی پہنچے تھیں۔ وہ جب انجمن کی ماں کے لیے کچھ نہ کر سکا تو  
 انجمن کے لیے کھنڈا لے کر نکلا۔ پہلے کفن دس روپے پانچ تھا اور اب بھی۔ ہاں روپے کی قیمت بازو میں پہلے سے کہیں زیادہ  
 گھٹ گئی تھی۔ جب انجمن کی ماں سری تھی تو بازار میں آٹا چاریر کا لہا تھا اور اب ڈھائی سیر کا بھی مشکل سے ملتا ہر جڑھنکائی کی  
 انتہا کو کھٹی بھٹی تھی۔ لیکن دکان کا پراگاشی انتہی سستا تھا جس سال پہلے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لڑائی شروع ہونے سے لگی جو  
 جڑھنکائی دس روپے کو کر دکان میں بھری گئی تھیں۔ وہ لڑائی شروع ہوتے ہی منگل ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ دس روپے کی چیز نے آٹھ دس  
 گنا بیع کیا۔ جو پانچ سو چھپے پرائی ہوئی گئیں وہ بیس روپے چھپے بھی۔ لیکن اس پر اسے کتنی کے دس روپے کی قیمت بازار میں بھٹی  
 ہو چلی تھی۔ دکان میں جن برس رہا تھا۔ مالک کے نام پر ویک میں سوئے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہو رہے تھے اسے کیا وہی منگل  
 کی بی بی بی بی آئی۔ جواب غار و رسوئی چھپے اپنی کیا روٹی سے مطلب۔ اسے تو چھپے دس روپے کے سامنے میں بھڑا دیا کیا تھا جہاں  
 ضروریات زندگی کی قیود کا روز بروز تکس ہی ہوتا رہا تھا۔ اس نے سارا کھڑو روپے نہ ہنگامی بہت لہا شروع کر دیا۔ کسانوں  
 کی بن آئی معمولی دکانوں کے ملازمین کی تنخواہوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور یہاں تک کہ ہوجو اٹھانے والوں نے بھی اپنی دھوری  
 بڑھا دی تو اس کے دل میں بھی اونگھ اٹھی کہ مالک کے اصف کہہ دے کہ میری کھواہ بہاؤ۔ لیکن شاید مالک نے اس کا خیال بھانپ  
 کر پہلے سے ہر وقت سنا شروع کر دیا کہ مفتی جی بڑھا پے سے تمہارا داروغہ خراب ہو گیا ہے۔ اب گھر ٹھوڑا کڑی چھوڑ کر۔ یہ دیکھ کر  
 نے حساب میں اتنی اتنی رقم انہیں نہیں جڑھی۔ مجھے مٹیوں کی کی نہیں۔ میں تو تمہارے پرانے ہوئے کا خیال کرتا ہوں گے۔ "اے  
 دن ہیں سن کہ اس کا بھی سوکنا کہ کہیں ان دس روپے کے بھی لانے نہ پڑ جائیں اور وہ اس دن کو کتا جب اس کے دل میں کھواہ

بات بات میں جی گھبرانے سے ناراض ہو گیا ہو۔

وہ اچس ہو کر کھڑکی ہوئی دالان سے نکل آئی اور اپنی چادر پکٹی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے ابا پر حسد رہا تھا کہ آخر وہ اس پر اسے نام روشنی پر قحط کیوں کرتے ہیں؟ علی کا تیل اسے روزانہ کیوں نہیں ملتا۔ جبکہ لگی کے کھڑا ہے تو صورت و انداز گھر میں تمام رات بڑی بڑی لائٹوں کی روشنی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کا گھنٹھلا اورا داغ ہی سو جی سی نہ کہ اگر تیل ملے گا تو ہلے گا۔ بڑے بڑے بھی لگے تو اس کے لیے دو چیمے روز کس کے گھر سے آئیں گے جبکہ اس کے باپ کو کھت کی قیمت صرف اتنی ہی ملتی ہے کہ وہ چنے تو کیا ہاں جینے کی بھڑتی سی نعل اتار رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سیاہ طاق میں رکھا ہوا چراغ۔ جس کی مدد ہم روشنی پر چاند طرف سے آنسو پھر اندر رہا تھا۔

انجمن شیعہ و باب کھلتی اپنی چار پائی پر اڑ چکے تھی۔ اس کا کافی گھبراہٹ اور ہر طرف سے سفید تھے بکڑوں کی کھنکھرات صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا کافی چارہ ہاتھ کا وہ زور زور سے رو کر اپنے الٹی قناعت پر بند کی کا احاطہ ہو چکے۔ لیکن اس سے رو کیا بھی نہ گیا۔ آسمانوں کا ذخیرہ تو جسے ملے جس کی گھنٹوں کا گھبراہٹ۔



بڑھوانے کا مخصوص خیال آیا تھا۔ اچھن کو سبھی جہازیں تھیں، ان کے لیے وہ انتہائی گھڑمگھا۔ پاس بڑھوانے کے لیے کئی کئی ایئر لائنز یا کو کھلا پہنچا نہیں سکتے تھے، تو کوئی کی کو انھیں دے سکتے تھے تو اسے اپنے گھر بار کا کروا دے۔ کھانے پہنچنے کی تو آپ ہی آپ ابھی ہو جاوے گی۔ لیکن مشورہ دینے والے بھی اسے سوچتے ہی نہ تھے کہ غریب کی لڑکی غریب ہی کے گھر جائے گی۔ کسی دانا بد رو پہ پانے والے کی صورت کیا پہنچے گی اور کیا کھائے گی۔ آخر اچھن کی اس بھی تو شور والی جہتی کون سا کھانا کھایا غریب نے؟

اچھن کو اس قدر غم پر طر پنے سے کھڑے نہ کہہ کر آپ کی طبیعت ابھتی ہی چلی جہازیں تھیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اس کے بڑے لڑکے کے بارے میں تو کچھ نہیں سنا ہو گا۔

”اچھا اس طرح کیوں کھڑی ہے؟ لے اب میں چڑی نہیں چاہوں گا۔“

”کچھ نہیں اہا“ اس نے دہرایا۔ سر اٹھا کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ چراغ کی کوڑھڑھادیوں ذرا“ اس کے لیے میں بڑی آرزو مند خوشامد تھی۔

لیکن یہ سن کر باپ پر سے جیسے ہماری بوجھ ہٹ گیا۔ اتنی معمولی سی بات تھی جس کے لیے وہ اتنی دیر سے یوں کھڑی تھی۔ اس نے سچا کچھ بھی نہ جاننا شروع کر دیا۔ اب وہ دھڑکنے لگا۔ وہ دھڑکنے میں تبدیلی کرنے کا خیال اس کے ذہن میں آ گیا۔ آخر غمخیزوں؟ اس نے کہا۔

”جانتی ہے کہ افغاراں میں کہیں دو چھپے کاشفی کا قتل ضبط ہوتا ہے اس پر بھی کیچڑ بھار میں اور اس کا قیصر ہوتا ہے کیڑے سمیٹتے ہیں۔ کب سے کہہ رہا ہوں کہ قتل پر کنٹرول ہے اور تو ہے کہ روز بروز لو جھانے کی شدت کرتی ہے۔“

”تو کیا قہار پسا جانے سے۔ دکھا دہرا تا نکل بھی نہ دیا کرے۔ اس سے تو اندھا چرا چڑا رہے۔ نہ تو نہ وہ چرا چلے گا۔ اس کی آنکھوں میں چٹکی ہوئی آرزو کے ختمے ختمے دیا جا چکے تھے۔“

”تاکہ وہاں کوئی نہیں معلوم ہے۔ بس انتہائی نکلے کے کہ چراغ جلا رہے۔“ آپ کی آواز سچ ہوگی جیسے اس احساس نے اسے  
 حسد دلایا ہو۔

”جاسے روٹنی نہ ہوگا“ اس کے ہونٹ ہلکے اٹھے۔

”ہاں“ باب کا جواب گھر کی سٹائن چار کی کوا اور بھی چار یک کر گیا۔

”میرا تو می اکتا ہے ایسے اگلے سے۔“ اس نے مردوسی آواز میں کہا۔ لیکن باب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے وہ جانی کے





"صاحب کو شرب کے ساتھ کباب بہت پسند ہیں۔ پارا صاحب کے تو پیوں بارہ رہے ہیں بیٹھ نیم صاحب کیا کھال ہیں کہ بھی رو پنے کی کمی نہیں ہوتی" صاحب ان کے ہوتے۔ "میں نے تو کو دیکھتے ہوئے ذرا شک سے کہا اور تو جو جھڑکے بے بی طرح مونڈے پر بٹھا ہوا تھا ملدی ملدی تجھیں ہچکے لگا۔ جس سے وہ کباب گین کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہتا ہی رہا۔

"ایسا ہی کوئی سالی عورت مجھے ملے جاتے تو ایک سال کے اندر اسی کوئی کے برابر اس سے اچھی کوئی کھڑی کر لوں گا میں بھی۔"

یہ سن کر تو نے دماغ میں پھر مجھے کوئی چیز ہلکے سے مل کر بھرتی۔ آخر وہ اتنا بیوقوف تو نہ تھا کہ میں کا اشارہ نہ دیکھتا۔ اس نے غصا کر اپنے حساب میں کم نہ پر جھٹکارے لکھا۔

"ارے بھیا صاحب بڑے آدمی ہیں ان کی بڑائی ہی ان کی عزت ہے۔ ہم تم غریب لوگ ہیں عزت ہی عزت دیکھتے ہیں اور موقع پڑے پاس کی خاطر غریب بھانے سے بھی نہیں چوتے۔"

"ہی ہی" "میں نے اپنی مونچھوں پر تڑا دیتے ہوئے آگے ہاد ہا کراہی مخصوص انداز میں ہنسا شروع کر دیا۔ جس سے تو نے سارے جسم میں جھنجھٹ مچ جاتی تھی۔ "بھوکا ہے پارا اس لیے اتنی سیدھی سوچتا ہے۔ جا بھائی کو اور بھیج دیکھا کباب روٹی دے دوں گا۔"

"نہ ہیدا! رہنے دے اللہ کی مرضی اگر اس میں ہے کہ ایک رات بھوکے سو رہیں تو کیا حرج ہے۔" تو نے اپنے پیٹ کی گڑ گڑاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی رکھائی سے کہا اور جیسے اس کی روح بھی مجھ کی کہ وہ اور ابھی اتنا بلند انسان ہے کہ عزت کے لیے بھوکا رہنا گوارا کر سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسے اپنی جسمانی کمزوری کا شدید احساس ہوا کہ کاش وہ ابھی مجھ کی طرح خوب سوتا تازہ ہوتا تو سزا چھکد چھکد میں کوئی مکی بات منہ سے نکال لیتا۔ جب دیکھو جب وہ کم بخت یونانی انت صلف مشورے دیا کرتا تو کو مجھے اس بد معاشر کی اماں جی نہیں تھیں۔ وہ اکثر تو کئی عورت سے بڑھ بڑھ کر مذاق پر اتر آتا۔ جس کی فطرت کئی بار تو مجھے بھی ہوتی۔ اس کم بخت نے زندگی کو کتنا لوپہ دار لگا رکھا تھا اس کی عورت سے۔ وہ اسے تاؤ میں آ کر ڈانٹتا ہے کہ تیرے بھی کرتاویات نفسی مذاق میں اڑ جاتی۔

میں ٹھن..... دو باروں پر تگی ہوئی برقی ٹھنکی بالکل تھکے کان کے پاس جی اور تو بڑا کرکڑا ہوا کیا۔ کہاؤں سے بھری پلیٹ کھینچی رکھ کر پلٹے گا تو مجھ سے ٹھنکی کی دھنکی لگ جائی۔

"دیکھ پارا راستے میں کھانا نہ لہو۔" اور تو نے جسم میں جیسے آسمانی کی گچھوٹ چھوٹ گئی۔ وہ بے بسی سے ہنست کاٹا ہوا

بارہی خانے سے باہر نکلا گیا۔ اب مارے رنج اور اذیت اکی بھوک مرگئی تھی۔ وہ اس طرح منہ اٹھانے کھانے کے کرے سے تک گیا جیسے اس کے ہاتھوں میں کباب ٹھس بٹھک کوئی بہت سی فلیٹ چیز ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ میں سے کھاتا کیا ہے؟ وہ فریب ضرور ہے فلیٹ بزرگ نہیں جو چوری کرنے لگے یا ایک عورت رکھ کر کوئی بٹانے کی فکر کرنے لگے۔

"ہاااا" صاحب میں پس کر رہی رہے تھے اور اپنی پی کر رہی رہے تھے۔ تو کو کچھ کر چکا رہے۔ اکی زبان بری طرح لڑکھاری تھی۔

"اچھے کھدے کباب اور مرغان کر دکھا مجھے۔ مرغان کر" بھگیا بھگیا "صاحب پر شرب اپنا پورا رنگ چڑھا چکی تھی۔ ان کی آنکھیں کچھ چمکی ہوئی تھیں اور چہرے پر وہ دم سا تھا۔ تو نے ان کے گم کو تاننا سنا کر کے چوری چوری ادھر ادھر دیکھا۔ نیم صاحب صراپے سے کھانے کے کرے سے غائب تھیں اور کرے سے ملنے غویہ کے دروازوں میں لگے ہوئے شیشوں کے اس پار سنان ادھر جراتھا۔ تو نے ایسا برائے بنا کر پلیٹ میں پر رکھ دی جیسے اس سے کوئی کڑوی سی چیز نکل لی ہو۔ حالانکہ وہ تقریباً دوڑا نہ بھی کھاتا دیکھتا تھا لیکن آج نہ چاہنے کیوں وہ اس اندھیرے کو کچھ کر بھانے سستی لذت حاصل کرنے کے کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"بے اتھو دیکھتا کیا ہے؟ اسے شرب چٹا ہوا ہے؟ میری عورت دوسرے کے پاس ہے یہ بھی برا ہے کیا؟ پر جب میری ناک تک کٹ گئی تھی ریل سے تو کیا میری شاندار کوئی کے ساتھ بیٹھ بھی گیا تھا میرے جسم سے؟ مجھے تو کسی کو ادھر روٹی نہ ہوتی۔ ہوئی تو میری عورت سے۔ خوبصورت اور جوان عورت سے۔ آہ! بارگ مجھ ٹکڑے کے سہارے کو بچھن لیتا چاہتے تھے۔ وہ سب اس سے کہتے تھے کہ تیری زندگی خراب ہوگئی۔ آہم جیسے لے بیٹھ اپنے ساتھ۔ یہ غصا اب تجھے کبھی نہیں دے سکا۔ کبھی نہیں۔

بھگیا؟ وہ میرے پار عورت کی جراثی دو دھلیے پلوں اور دو ناگوں کے غصے طریقے نہ چاہتے تھے۔ پر یہ کیسے ہو سکتا تھا اور اب تمام وہی لوگ ایک وقت میں اپنی بھری جھین میرے سامنے خالی کر دیتے ہیں۔ ہاااا..... پر مجھے تو بری ہی غصوں سے بند کچھ لگھے کی بھی برائے کہے۔ میں نے وہی کیا جو میرے نہ چاہنے کے پارا دھکی ہوتا۔" صاحب نے نشے میں مجھم مجھم کر کہا اس جو شروع کی تو سلسلہ دیر تک قائم نہ ہوا۔ وہ ہر بات کو یاد دہانی جانے کے بعد اپنے سینے سے غصہ کی دلی دہائی کرنا کوئی طرح ٹھوس تھتے۔ شرابی ویسے ہی نشے میں بہت زیادہ صاف گواہ ہوتا ہے لیکن صاحب تو اپنی چوری زندگی کو بالکل ہی نکال کر دیتے۔ دن میں وہ کتنے عجیبہ بھگدی قدر خوفناک سے نظر آتے تھے۔ اچھے اچھے لوگوں کی زبانیں لڑکھا رہی تھیں ان سے بات کرتے ہوئے اور ان کو کڑی تو حوالہ نہ دیتی دم مارنے کی ان کے سامنے فسطویا ملی جو ان کو کڑی کے بیچ میں چرس کا دم لگانے کے بعد صاحب کو گالیاں تک دیتے نہ چھٹا تھا۔ ان کی

[illegible]

سات کوئین بارہ چپے کے بعد وہ اپنی زانی سے فارغ ہو کر کھڑی سے اٹھا اور سفید پتھر کی سیڑھیوں کو کھینچنے کو کہنے لگا وہ نے اسے  
 ہلے گا اور اچھا اتر اور پھر اچھا سر جھکائے کھڑی کے پیچھے اڑے گی ہوئی تو کہوں چا کہوں کی طرف چل دیا۔ شراف  
 سینے کا بازو اس کا ہاتھ ٹوک کر اسے خاموش کھڑے ہوئے وہ فضا کی آڑ سے کسی بھی روشنی اس کی راہ میں بھیجا جا رہا تھا۔ موسم خزاں  
 کی چھٹ میں آئے ہوئے تھے ہی سو کھٹے چپے اس کے قدموں سے آ کر کھڑکھڑائے جو چراغے لیکن وہ کسی حیرت زدہ شخص کی طرح بے  
 خبر سا تھا۔ اپنی ہی کھڑی کے نزدیک پہنچ گیا کہ زانی سے اسے فضا کے درمیان حال اس کا کھڑی میں داخل ہو گیا۔

کونھڑی کی گرم اور اسی کوئی فصیح طاق پر کھاکھا چڑا کر جو دروہوں اگلے ہاتھ اور خوشی صورت چار پائی پر ہے سداہ پڑی  
سورجی تھی۔ چڑا ہونے ہونے کچھ کھلے سے۔ بھری بھری پنڈول پر ہے جو تھی ڈاراسر کی ہوئی اور بالوں کی فکھو فکھو نعلیں

جاتے پر سوئی ہوئی تھوڑے ایک جیسی کوئی سی نظرس پر ڈالی اور اپنا ٹاٹ اٹھا کر کوئی پر تھکے گا۔ کوٹ دیکھتے ہوئے اس نے مارے تختہ کے اپنے ہاتھ میں تیر لڑش محسوس کی تو اس کی آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ رنگوں میں ہلک کی تیز سنسنی بہت نہ تانے بھر نہ گئی اور وہ دوسرا کمرہ میں پر پڑ گیا۔ اسے یہ احساس بری طرح تانے گا کہ وہ بھی کتنا مجبور ہے جو ہلکا ہونے کے باوجود ہوتے پر ڈال دیا گیا کہ کھانا نہیں کھا سکتا۔

چراغ کی گودھواں اگلے چادری تھی۔ جو ہر گودھواں اور نواہنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چراغ پر گاڑے ہوئے تھا۔ اس کا نسیم اس طرح سے حس اور حرکت تھا جیسے دھرم گاہی ہو۔ ہلک کی شدت سے پیٹ میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تیز کرچن موسوں ہو رہی تھی اور اس کے گتہ گتہ خیالات کا پر شور ہمارا موڑ پر آ گیا تھا۔ بڑے سی خطرناک موڑ پر۔ اس موڑ پر جس کے خیال ہی سے وہ زراد پر پہلے جمن کی موجوں میں بھول جانے کی سوچ رہا تھا لیکن ہلک کا نغمہ صاحب کی کپڑا ہوئی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ ہوش کن تھا۔ تھوہک بھک کر سوچ رہا تھا کہ اس طرح میں حرج ہی کیا ہے اگرچہ جسم کا پیر زراد پر کوئی دوسرے نے بھی نہیں کیا۔ مہادے میں اپنے دھرم جی مکرے ہو گئے۔ وہ کپڑا تو پھر اپنی ہی ہے۔ میل کیل کی کپڑا تو وہ ہے آپ اب ایسی کر سیکل پر کیل پر نظری نہیں پہنچتی۔ دنیا والوں کی۔ صاحب بھی تو ہیں ایک۔ تاکہ تھکے تھکے قاتل آپ داخل ہو سکے سب سے لیکن ابھی اس کا سامنے کافی کر رہا ہے کھاتے ہیں۔ سب آنے جانے والے ہم صاحب سے زیادہ اچھی کے بازو اٹھاتے ہیں اور سنا ہے کہ کوٹھی سے باہر جی ان کی غاص عزت ہے۔ بڑے بڑے کاسوں میں انیس خرد و صحت دی جاتی ہے۔ ہمارا طرح کا لاشا میں جاتے ہوئے بھی صاحب کہا ہے ہیں اور ان کی صحت ہم صاحب۔ اور ہم صاحب بھی تو بہت چاقی ہیں صاحب تو فرض کیج کہتا ہے کہ میں صاحب کے تو پاؤں بارہا دے رہے ہیں۔ میرے پاس بھی جی سب کچھ ہو جانے کا تو لوگ مجھے بھی صاحب کہا کریں گے اور میری مہربا کہ ہم صاحب آپا پھر دیکھوں گا اس سالی دنیا کو میں نے ہمیشہ تھوکر ٹھوکے ماری۔ اور ہاں وہ جس میں بہت اچھا دھرم اور کیا کلاس کے لیے میری صحت کو کاٹا ہے۔ ایسا ہی تو چمکا ہے۔

خوشی کے جسم میں ڈرا جانے لگی۔ اس نے عمارت سے منہ ہٹا دیا اور فرور سے گردن گھما کر چارپائی پر بے سہمہ پڑی ہوئی عورت کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس کے ہاتھ میں ساری دنیا کی جاگ اور ہے۔ چراغ کی ڈراہم روشنی میں سوئی ہوئی تو خیر عورت کا صحن جاگ رہا تھا۔ خوشی آگھوں میں سرست کی کرئیں خم لینے لگیں کرا آتھی غریب صورت ہے اس کی عورت اور اس کی قیمت صحن کا تھا ہے چندہ ٹھکانا اور کراپ آگیا سناوے صحن بھی۔

تقریبی سی بی میں مسکرایا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ہم صاحب آگئیں موٹاپے کی طرف، کل جسم گوری رحمت بڑی لیکن گول آنکھیں قدرے چھٹی تاک اور مونے مونے ہونٹ۔ ایسے ہونٹ جو سرخی چھنے کے بعد جو کوس کی مانند دکھائی پڑے خون چس کر پھولی ہوئی کالی جوتھیں۔ کچھ بڑا وہ اچھی نہ تھیں وہ اس پر بھی دو سو سو پیڑ سے کم پر کسی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتیں۔ اس ان کے دم سے کوئی میں دوست کی ریل پٹیل تھی۔ ان کے متابلے میں اس کی صورت کتنی خوبصورت اور کس قدر ذرا کچی تو کیا وہ میں بخا دینے سے قاصر ہو سکتی تھی؟

تھو کے سی پرست کا گھر گدا سا جو پھر پھر بھاری ہونے لگا اور اس کی کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے چراغ کی کپکپاتی ہوئی لو نے بڑے سے برقی قلعے کا روپ دھار لیا اور اس کی ہم جا رہا ایک کوٹھڑی بڑی سی شاندار سی کھائی کوئی میں تہہ ل ہو گئی۔ کوٹھڑی کے ایک کونے میں بیٹا ہوا چمپا جس میں ٹھنڈی راکھ پائی پڑی تھی ایک دم گرم ہو گیا اور ایک من میں جیسا ہوا پڑی گرم دھڑکنے کا ہوا جھپکا ہوا آہا۔ آہا۔

تھو کے جسم میں جاتے کہاں سے طاقت بھر گئی اور وہ اٹھ کر اپنی عورت کی چار پائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ اب تک سے خبر سوری تھی۔ وہی کھلے کھلے ہونٹ بھری سی نہیں اور کچی چڑ لیا۔ جیسے وہ فکان سے چڑھ کر آرام کی خند سوئی ہو۔ تھو ہلے سے اس پر ہلک گیا اور اس طرح ہلے سے اس کے جسم پر ہاتھ بھیرنے لگا۔ جس طرح کپڑے کی کسی دکان پر کوئی دیکھان دیکھ کر بڑے کے فکان کو چھو سے بہت عیار سے اٹھنے لگا۔ جس طرح کپڑے کی کسی دکان پر کوئی دیکھان دیکھ کر بڑے عورت کا جسم اس کے لیے پھیلے ہاتھ پر پھیلے کو لیے سے بھی بڑا تھا قہر اب؟ اب تو وہی جسم اس کے لیے سب بکھتا۔ تھو کا مٹی چا ہا کہ اسے ہکا کر اپنی جنت کی راہ بتا دے۔ لیکن پھر یہ سوچی کہ اس کے قریب سے ہٹ آیا کہ کہیں وہ بھڑک نہ جائے سن کہ جب اس راہ پر قدم رکھ کے تو پھر آپ سی آپ بیٹھ اور آرام کی جھکا جاتی ہوئی دنیا کی طرف لپکتے لپکتے گئی۔

تھو نے اپنے پیٹلے سے مطمئن ہو کر ایک آنکھ لی۔ ایک دم کی طور سے پانی پیا اور حال پر سے بیڑی کا دو ٹکڑا اٹھا کر سٹکا یا جو وہ صبح بے نیالی میں طاق پر پھینک گیا تھا۔

رات کا غوغا ک آگ جیڑی سے ریگ رہا تھا اور تھو کے اعصاب جڑ جڑ بھی اچھا کھینچ رہے تھے۔ اس کی بھوک زندہ تھی اور روتی حاصل کرنے کا خیال جان ا

تھو کے اندر چھپ کر بیٹھا اور اسان گولہ ہو گیا تھا یا شاہ دو بھی ہو گا ہو۔

دوسرے دن ...

رات کے کیا روزانہ چکے تھے۔ ہم صاحب کی سکرانٹ میں دعوت اپنے شہاب پر تھی۔ شراب کی کئی بوتلیں کھل کر اڑ چکی تھیں۔ دونوں مہمانوں میں سے مولا مہمان بی کر بالکل عی ہے آپ تھا۔ وہ ہم صاحب سے جاتے کیا فاضول بکواس کر رہا تھا اور صاحب کے ہاتھ پر ایک جیڑی ابھر رہی تھی۔

دوسرے دن پٹیلے کو جان مہمان نے گھاس سے آخری ٹھونٹ پی کر جب میں ہاتھ ڈالا اور دونوں کی ایک گڈی صاحب کے سامنے رکھ دی۔ تھو نے صاحب کے ساتھ کھینچیں سے گنا۔ دس دس روپے کے بارہا تھو تھے اور تھو کا مٹی لٹا کر دیا گیا۔ مونے مہمان نے بھی مجھ کو جب میں ہاتھ ڈالا اور دونوں کی ایک گڈی صاحب کے سامنے پھینک دی۔ تھو نے بھرا گنا۔ دس دس روپے کے میں نوٹ! تھو کا سیدارے لٹا کے پھینکے گنا۔ صاحب نے مونے مہمان کے نوٹ اپنی جیب میں خوش لے۔ اب ان کے ہاتھ کی جیڑی اتر چکی تھی۔ ہم صاحب سکرانٹ ہوئی مونے مہمان کے ساتھ کوٹھڑی ہو گئیں۔ دوسرے مہمان کے دونوں کی گڈی بے قدر دی سے بیڑی پر پڑی رہی۔

"اور کہاں لا" صاحب نے اپنے گھاس کی پٹی ہوئی شراب معلق میں اٹھنے کے بعد مجھ کو کہا اور تھو چک کر ہا ہر لٹل گیا۔ تھو جب کہاں سے کرنا تو دیکھا کہ دوسرا مہمان بکواس لٹکا کر سے سے کل رہا تھا۔ تھو نے جلدی سے کہا صاحب کے سامنے رکھے اور پھر تھو چھینے ہونے صاحب کو گھاس بکواس لٹکا کر دوسرے مہمان کے پیچھے تک گیا بالکل اندھا ہوا کہ اسے روٹھے ہونے نور جان مہمان کے پیچھے ہونے ایک سو میں روپے وصول کرنا تھے۔ وہ بیڑی میں اترتے ہوئے کرتے کرتے بکواس لٹکوں سے بھرا یا لیکن پھر کچی اندھا حداد دھڑکاڑا رہا۔ اور آخراں سے بھوٹے جھوٹے مہمان کو اس کی موٹر کے پاس جا بکڑا۔

"صاحب صاحب! آؤ راکر گنا" تھو جیسے اس سے ہلکا دھمکا رہا تھا۔

"اور نہیں! ام نہیں جا میں گے۔ تم کو دوش تھو نے سے سمجھا ہے۔ ام نہیں جا میں گے۔ ام اس مونے کو مار ڈالیں گے۔" وہ بہت جلد ہوا تھا۔

"صاحب! وہ سوئی عورت تو بہت بری ہے۔ آپ میرے ساتھ آئے میں لے چلوں حضور کو عورت نہیں پڑی ہے پڑی۔ ابھی بالکل کسین ہے صاحب! تھو نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور صاحب مجھ سے بھاگے انکے ساتھ ہو گئے۔

تھو نے آگے بڑھ کر کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور صاحب ڈنگا گئے ہونے کوٹھڑی میں پٹے گئے۔





میں نے اپنی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اماں اور باپ باغ و فکروں کے بندھا ہوا اسباب نکال نکال کر خوش خوشی مناسب جگہوں پر لگا رہے تھے۔ آٹا پاور پی خانے میں بیٹھی اپنا بیٹھی بیکہ پونہ بار بار اس طرح سر پر ڈال رہی تھی کہ چھوٹا سا گھگھٹ اس کی پیشانی پر ہنک آتا اور پھر غریب اور ادھر دیکھ کر سرخ سی پڑ جاتی اور پونہ سر سے اٹھکا دیتی۔ کچھ دن پہلے آٹا شادی کی بات بڑی بڑی سوچوں والے ایک زمیندار کی طرف سے آئی تھی۔ لیکن اماں نے اپنے زانو پیٹ پیٹ کر باپ سے صاف کہہ دیا تھا کہ "میں اس کو اس کی اپنی بیٹی کی شادی اس گھگھٹ سے کیا میری بیٹی ادا کر کے کچا کرے گی اسے؟ انکی جائیداد بونے کر چا پنا ہے میں؟ اور پھر لوطی کی ایسی عمری کیا ہے جو اچھی سے آفت بچ گئی۔ تیرہ برس کی جان اپنے اچھے برے تک کا شعور نہیں۔ اس پر چلے ہیں اقرار اس بار سے ہے بچا ہے۔" اور جانے کیا کیا جھگڑے ہوئے کہ زمیندار صاحب کو اپنی گلی گلی کھف اور بیکڑی میں سوچوں سماسات لے کر جاتا رہا۔ مگر نہ جانے آپا کے دوپٹے کو کیا ہوا تھا کہ کھائی میں گھگھٹ ضرور بن جاتا۔ اس وقت بھی مجھے اس کی گھگھٹ کچھ کمزور نہ لگی لیکن آپا نے مجھے بتاتے ہوئے دیکھا کہ ایک دم گھبرا گئی۔

"لے آتھو رداں مٹی ناشر دکھا ہے میرا" وہ جلدی جلدی پلکیں چمکاتے ہوئے بولی اور پھر اپنا دوپٹہ بالکل گھونٹ کے اندام میں سر پر ڈال کر تاک بھوں تکیرتے ہوئے اس طرح آدھے سر کا یاچھے سارا قصہ کہہ کر اپنے دوپٹے ہی کا ہو۔ مگر آپا تو ناحق ہی میرے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔ مجھے تو اس وقت صرف اپنی بیڑی ہی چاہند ہو رہی تھی۔ بس پار بار اپنی بھاری ہوئی کوئی تان سکھایاں دے مگر کچھ یاد آتی تھیں اور میں رو جاتا تھا مٹی۔ لیکن آتھو سٹوٹھ میں چھند سے ان کے گھونٹے ڈالتے تھے۔ میری یاد پار ہوا تھا کہ اپنی جا بگیا تاکر کچھک دوں اور فراق اٹھا کر راتوں میں دبانے دبانے اس کے سامنے چل جاؤں اور دوں مجھے "سات برس کی لڑکی ابھی تک کپڑا چھنے کی عادت نہ گئی" کہہ کر پیٹ ڈالیں لیکن اماں کی مصروفیت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ مجھے ان کا متوجہ کرنا دشوار معلوم ہوا اور میں جہاں کی توں بھری بیٹھی رہی۔

اماں ایک کمرے میں کہہ رہے تھے "تیکرا اور اصل دیہاتوں ہی میں زندگی کا حرا ہے۔ خالص مٹی، تازہ وودھ، مکلی ہوئی فضا اور صاف ہوا... اور پھر دیہاتوں کے باشندے بھی کسی قدر مصمم ہوتے ہیں۔ شہر کے چمیل بٹوں سے ناواقف، سرکاری نوکروں کی توہمتی عزت کرتے ہیں جیسے... جیسے دیہاتوں کی۔ یہی سی "اماں نے بھی اپنی کھٹکی مٹی مٹی سے ان کی پس میں جا خالی اور میرے دل کا پوچھ پچھلے سے گھٹن پرانہ بھاری ہونے لگا۔

"ہوں! بڑا چھاپا دیہات" میں نے بدائی۔

دادی جان سیکر میں کھٹکی اور اپنا دوپٹہ سنبھالتی جاتے کہ کام سے میرے قریب سے گزرتے تھیں اور پھر جیسے کام بھول کر اداس جھول پڑتی۔

"اوری شدہ ابھی تک بستر پر پڑی ہے۔ اتنے تو بائیس گھنٹے سے اس گھر پر۔ کوئی بھی تو سو رہا لگنے سے پہلے نہیں اٹھتا۔ کج تو یہ ہے کہ کوئی اللہ رسول کا نام تو لیتا نہیں جو اپنی خیزدہاں کی جائے۔ پھر اس گھر پر آفتیں نہ آئیں تو کیا ہو؟ اور کیوں ای شدہ اقل تو نے ریل میں انکی لے کر گھر سے وودھ کیا تھا کہ اب نماز پڑھا کر ان کی پانچ وقت کی۔ آج فجر کی نماز تیرے فرشتوں نے پڑھی ہوئی کیوں؟ دادی نے اپنا گھر دیا تھا میرے سر پر اس زور سے دکھا کہ مجھے ہلکی چٹ تک گئی۔ چوت کا احساس ہوا تھا کہ جتنی ہوئی آٹھیں آٹھوں میں ادب گئیں۔ محل میں پڑے ہوئے چھند سے ٹوٹے تو کچے میں غرش پیدا کرتی ہوئی تھیں مگر بھر میں گونج اٹھیں۔ بس یہی اونٹ اونٹ کر دیا آپا کی اناٹ اپٹ کہاں کی دھسکیاں اور دادی جان کا پیار دار سب بگاڑ گیا۔ بس میری ایک قیامت چار رہی۔" "تم تو اپنے گھر جا گیا گے۔ اچھا اچھا"

"نہایت اسات برس کی ہونہ آتی ابھی تک نمی کے منہ سے وودھ ہی نکلا آ رہا ہے۔ وہاں اس کی اماں کی قبر ہے؟ اماں نے دانست لکھا کہ اور میرے کوسے پر ایک گھونٹ لڑا۔

"چپ... چپ! اب آواز نہ لگے۔" اماں نے بھی کیا کر میرے دلوں کا نل ڈالے۔ لیکن دادی نے اچانک اماں اور اماں کے خلاف یہ کہہ کر اعلان جنگ کر دیا کہ اپنے ہوش میں رہو اور بڑے آئے سچے پالنے والے لیکن لکھا ہے کہ تھاری تھاری بھری کتابوں میں نہ کہنے کی طبیعت دیکھو نہ حالت "بس کس کے جانو گے وودھ جیڑی دے پے سی دور دور بھگان ہوئی جاری ہے۔" دادی جان برابر اماں اور اماں کے خلاف لگا۔ باری کچے جاری تھیں۔

اماں اور اماں تاکر میرے پاس سے چلے گئے۔ آپا غور غور دی بار پڑتی خانے سے اٹھ کر میرے چنگ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کا کچھ لگاؤ نہ ہوا میں نہیں لے رہا تھا اور مجھے اپنی "زیر دین" خود بھی بڑی مشکل خیز لگ رہی تھی۔

"شادیاں ارانی جی؟" آپا نے ہاتھ میرے سر پر بڑے پیار سے رکھ دیا اور میں نے چنگ پر اپنا بیڑا کر اپنی "زیر دین" کو ایک دم اونچے سروں پر چڑھا دیا نے اس آٹھیں بچھا کر میرے بالوں میں اپنی نرم نرم اٹھیں سے لکھی کہ شروع کی تو میرا چہرہ چڑھتا ہوا دکھائی دیا۔

"بہت جانا آپا۔" میں تو ہم جہاری دکھایت کر دیں کے کہ تم گھگھٹ....." میں نے اچھا بھلا نہ تمام چھوڑ کر اس کی اٹھیاں مروڑ

واپس اور وہاں کھائی ہوئی کھانسی کی طرح دھیرے دھیرے باورچی خانے میں چل گئی۔ سامبرے دل میں اس کے لیے جھڑکی کی ایک لمبی سی لہر ابھری جو دوسرے سی لمبے میرے چڑچڑے پن اور ضد کی چٹانوں سے ٹکرا کر گم ہو گئی۔ دادی جان بھر میری طرف جھول گئیں۔

”روئے جاری ہے۔ کتنا تو کہہ لیا تو حیرتی غاظران دونوں کو۔ کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔ اگلی توپ“ اور مجھے خیال آیا کہ دادی جان سراسر جھوٹ بولی رہی ہیں۔ میں ہرگز اتنے زور سے نہیں رو رہی جتنے زور سے تو قادیلوں کے پکاراؤں پھیلتے ہیں اور انہیں سن کر وہ گھٹنوں جھومتی رہتی ہیں۔

”لے لگاؤ انہوں نے کھوا پر گود سے پٹا۔ کھڑا اس کا کچھ رہا ہے۔ یہ نہیں کہ باہر جا کر زور دہلائے۔“

میں بھی روتے روتے جھوٹک گئی تھی۔ اسی لیے بھلائے جانے اور دادی جان کی تحریک کو بھی جاننے لگا کہ بغیر لمبائی بھرکتا ہیں پڑے میرے دل کی بات کھ گئیں۔

کھو امبرے اٹھتے پردے جسم کو دل میں ڈاکر باہر لے جانے کا خواہش تھا کہ باہر سے ہائی دواڑی ہوئی آئی اور میری جگہوں سے لڑ گئی۔ اسے دیکھ کر میرا چڑچڑاہن دور ہو گیا اور میں سوچنے لگی کہ پیچ سے غائب کہاں تھی۔ ہائی جب سے ابھی بڑی بڑی آنکھیں چھڑ چھا کر بولی۔ ”قصہ جانے جاری تھی میں چلو باہر دیکھو کتنا شہ؟“ اٹھ قسم حرا آجائے گا۔“

میں غم سے زمین پر کود گئی اور اس کے ساتھ جھاک کر باہر کے برآمدے میں آ گئی۔ وہاں تارا اور موہی پھلے سی شور مچا رہے تھے۔ برآمدے سے ذرا فاصلے پر احاطے میں ایک لمبی دھڑکی عورت کھڑی خاک میں اٹے ہوئے چھوئے چھوئے بالوں کو بری طرح کھسکتی رہی تھی اور اپنے بڑے بڑے زور و دانت لگانے فرار ہی تھی۔ لیکن کھوار تارا رتے کڑھن سے مٹی کے اچیلے اور کھراٹھا اٹھا کس کی پیچھے ہی چلے جا رہے تھے۔

”توئی ہے؟“ یہ تو بھی مارا نہیں تو بھی کو چاہا ہائے گی۔ ہاں ہاں ہم نہیں جانتے۔“ مونے کس قدر خوف سے اپنی آنکھیں پھیلا کر بڑے دھوکے سے کہا اور بھر ایک بڑا سائل کا وسیلا اٹھا کر جھپٹکا تو سیدھا بھونک کے منکا جیسے پیٹ پر پٹک بھری تھی ہو گیا۔ بھونک نے زور سے پھٹ کر اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے اور بھرا ہائی بانس میں پکی پکی جگہیں گھس گئیں۔ ہمارے پیچھے ہوئے اٹھلوں کی بارش میں جانے لگا کھر ہو گئی۔

”بھگا دیا میں نے اس بھونک کو۔“ کھواڑ کر بولا۔ ”میں تو سب کر چکی۔ دیکھا تھا اس کا پیٹ کتنا بڑا تھا؟“ وہ چارے

جوان مرد کی طرح ہم تینوں بچوں پر اپنا رعب بٹھا رہا تھا۔

”ہاں بھیا اور وہ کیسے دانت نکال کر فرار ہی تھی جیسے بلیاں فرار ہی ہوں۔“ یعنی اٹھ توپ یا کھل گئی تھی تو جی۔“ تارا جلدی جلدی آنکھیں پھیکا کر بولی۔ ”اور بائی ابھو سچوں کو شرم نہیں آتی؟“ وہ زوردار شرا کر پچھنے لگی اور بائی نے ٹاک بھوں چڑھا کر کہا۔ ”لو کھائی! وہ تو بھونک ہے اور بھونکیاں کپڑے پہن ہی کیسے سکتی ہیں؟ کیوں ہے؟“ اٹھ؟“ بائی نے مجھ سے بھی تاکید کرنا چاہی لیکن میں تو جیسے سم کر رہ گئی تھی۔ مٹی چادر اٹھا کر اسی وقت کارہا سے کھوں کو گھسیٹا بڑا چھاپا ہے آپ کا دیہات۔ اب بھونکیاں کپڑا چاہا کیسے کی سب کو۔ لیکن میں شرافت کے دباؤ میں رہتے ہوئے اب اسے اتار کر مٹی کی کارہا ایک لٹکا مٹی نہ بول سکتی اور اس میں خود کو افسردہ شرافت کی جھ پر چھائی۔ دن بھر کوشش کرنے کے باوجود کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ اور سارا دن بھونک کے خیال سے اپنے جسم میں خلیفہ سے لپکی محسوس کرتی رہی۔ ذرا بھی اکیلی ہوئی تو ابنا گت جیسے پیچھے سے بھونک بڑی جلی آ رہی ہے۔ وہی بڑا سا پیٹ اور کتلی پتل جگہیں جیسے فرخ آبادی تریز میں دو پتے پتے کھٹے کو کھوس دینے گئے ہوں۔ میں مارے خوف کے اکیلے چٹک پر بھی نہ لگتی۔ بس سب میں محسوس کھس کر خفگی اور دل ہی دل میں تیش افی کہ ”اے اللہ میں تو کچھ ایسا کر دے کہ ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ بھر میں دو پچی کھیں پر جنازہ دلو اور اس کی نماز بھی پڑھوں گی یا چوں وقت اور قریب بھی پھرایا کروں گی اور اب شرارت سے دادی جان کے نماز پڑھنے میں سامنے سے بھی نہ لٹھوں کی اور نہ کبھی کبھی بات پر ضد کیا کروں گی۔ میرے اللہ میں ایسا ہو جائے تو۔“

میری کئی دن کی دعا میں اتنی طویل ہو گئیں کہ کچھ کر دھ گئیں اور میں اتنی گامی کرنے لگے۔

ایک ہفتہ کر گیا اور کوئی ایسی صورت نہ پیدا ہوئی کہ ہم وہاں سے چلے جاتے اور نہ بھر بھونک ہی دکھائی دی۔ جب اللہ میں کا وہ سہارا جو انسان اور جانور کے درمیان انکار جتا ہے ہاتھ نہ آیا تو اپنی حالت پر آپ سی مطمئن ہو گئی۔ یہاں تک کہ میں نے اس نئی جگہ کو اپنا کر کرنے کی کھائی۔ کھوا اور بائی کے ساتھ دھکی زمین کو اپنے پھروں سے خوب خوب رو دنا۔ قدموں کے نیچے کھس کر گئی ہوئی ریت کو بھی بھر کر لایا۔ سیاہ بھر پل کی چٹوں والے گورے سے لپے کچے مکاؤں میں جھاکا جھاکا جھری زمین پر اس سے تر تھی سے جتے ہوئے تھے جیسے کسی جڑے بیماری دھ لے آئی آسمان برابر جھولی میں سے ٹھکی بھران مکاؤں کی نکال کر کھٹا میں اچھا دل ہو اور چاول کے دانوں کی طرح بکھر گئے ہوں۔ ہماری دو چہروں میں جب داناں اور لہا کر گم ہو اور موہی سے بچنے کی جدایت کر کے اپنے کمرے میں کھس جاتے اور دادی تارک یک کمرے میں چھٹا جھٹکتے اور آنکھیں پچھاتے اٹھ جاتیں تو میں کھوا اور بائی کے ساتھ لٹکے پاؤں باہر نکل کر نئے نئے کھروں کی راستہ دیکھ کر کتا شاد بھونک اور بھونک ہوئی ریت پر کھوئے جانے کی کوشش کرتی۔



دوران میں برابر ادھر ادھر دیکھتی جاتی کہ کبھی تارہ نکلو یا گھر کی نئی بارہاں نوٹیں آ رہی؟ جو ماں سے وفایت جزو ہے اور بھراں  
 ادا کی اچھی طرح کھس کر میں کیا عالم ظلم کیمن ٹھونے ہر مہر بھرا

دو ایک سینے میں میرانی وہاں لگ سا گیا تھا یا مجبور لگا کر چکا تھا۔ اب نہ تو مجھے اپنی بھجوری ہوئی کہ نیاں یاد آئیں اور نہ رونے  
 چاہئے کسی دور دور پر نہ۔ ابھی کا خیال بھی ایک خواب سا ہو گیا۔ اب وہاں کی ہر چیز مجھے باتوں محسوس ہونے لگی۔ گھر گھر سے باہر  
 ریت نہ گھر میں چکا نہ ہر داراں گھٹتے ہوئے مٹی کے بت چھپے ہاتھ۔ ہر ایک میں گہری اپنا حیات کی محسوس ہوتی تھیں جیسے میں نے  
 لیے ہیں اسی جی اسی اور ایسے سے سیکس رہی تھی۔

لیکن ایک دن یہ دیکھ کر کہا ابھی ادا کی طرح وہ پیر کو کھوٹے پھرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ میرا نکلا ہوا دل رات کے کونل کی  
 طرح مسروقہ کو دباتے ہوئے سٹ گیا۔ میں نے اپنا فیصلہ مٹا دیا کہ ابھی اب وہ پیر کو پھر نہیں نکلتا چاہیے۔ ورنہ شاید کچھ  
 پاتی کریں گے۔

”مگر جناب!“ مقرر مقررانہ لہجے میں بولا۔ ”یہ کبھی نہیں آتا کہ ابھی گھنٹی کا دہندہ کیوں محسوس رہے تھے گھر میں اس کے جھنڈ  
 میں؟ اور گھنٹی کے باپ نے ابا کو متنبہ بھی کیا جبکہ وہ سائے جھونپڑیاں میں بیٹھا چلم پی رہا تھا؟ اگر گھنٹی کا دہندہ چھٹ جاتا تو دوسرا کہاں  
 سے لائی فریب؟“

”واہ جناب!“ اپنی اپنی حیران آنکھیں اٹھا کر بولی۔ ”گھنٹی کا ابا ہمارے ابا کو متنبہ کر سکتا تھا بھلا؟ اسے چل میں بند کر کے  
 چابی سے انگڑیاں کھاتے؟ یا کبھی کبھی تھماں دن۔ سوئی کے مہاں کو کیا باہر لایا تھا چابی سے؟ دارا نہ تو ہی ہمارے ابا ہاں۔“

”کون سوئی؟“ میں دماغ پر زور دیتے ہوئے بڑبڑائی۔

”ارے وہی حیران! جس گہواں میں گھٹتے آئی تھی نا ایک دن؟ ارے وہی کالا بھورا ہی! خوب ملک ملک کر اٹھتی تھی۔“ ہامی میرے  
 حافظہ پر بھینچا کر بولی اور مجھے وہ سوئی یاد آ گئی۔ کئی سالوں سے مجھ میں گھٹتے گھٹتے اور سانچے میں دھلا ہوا جسم اس دن ابا  
 گہواں میں روہانے والی کوڑا کرکٹ سے پیدا ہونے والی ٹوٹا کچا چاروں کا بار بار نہ کہہ کرتے رہے اور روہ کہنے پہنچے گہواں  
 خود مانچتے رہے۔ مگر اباں جیسے ابا کی باتوں پر کان دھرنے بلیر بارش کی ادھر ادھر بھرتی رہی۔ ”تو کربا پر شام کو نکلا کریں گے  
 گھوٹے میں! ابجور ابا ہم نے قاصت کا وارنٹ پاس کر دیا۔“

لیکن میرا ہی بھر مار دینے کو چاہئے گا۔ اول تو دن بھر گھر میں بند رہنا بھراں کا آغواں پیر کا فصد۔ جانے کیوں اباں پہلی کھس نہ

گھر کے لیے تو مجھے درشتوں کو جاننا ہوا دیکھو تھے دیکھ کر ان پر گھر میں کی طرح چڑھنے کی کوشش کرتی یا گھر کو سے مشورے سے  
 نکلتے چھپک چھپک کر گھر میں گرنا نہ کی کوشش کرتی۔ اس دوران میں اگر گھر کے درشتوں کا ملک اپنی جھونپڑی سے گردن نکال کر  
 ہمیں دیکھنے لگتا تو یہ سبیل زادہ دلچسپ معلوم ہونے لگتا۔ لیکن جب وہ نہ دیکھتا تو اس مسئلے سے جلدی ہی نہ کرتا جاتا اور ہم خبر تک جانے  
 کے لیے کسی دھچکا دھچکا ہوئی تھل گاڑی کا اٹھ کر نہ کرتے تھے۔ قہوری دیر بعد کوئی نہ کوئی تھل گاڑی نظر آتی جاتی اور ہم سب بلیر کچھ  
 کہے سے اس کے پیچھے پھلتے شل تک جاتے۔ گاڑی والا بھی گھروں والے کی طرح ادا کی زبردستی پر کچھ نہ کچھ کرتا۔ یہاں تک کہ  
 ہم ہاتھ نہ دھوئے اور پھٹکھیں اڑانے کے لیے نہر پر نکلتے جاتے اور نہر کے دونوں طرف پیسے ہونے کھتوں میں سے جو چاہئے تو ز  
 توڑ کر براد کر دیتے۔ لیکن کا شکار چوں تک نہ کرتے۔ بس بڑی سی پیسے میں لکر کر دیکھ کر رو جاتے۔ یہ رنگ دیکھ کر شو کا قہقہہ  
 نہ پید ہو جاتا وہ خود بخود اہم دونوں بہنوں کے جنگلی لے کر یا دھکا دے کر اچھٹا کودتا کھتوں کے اندر گھس جاتا اور ہم دونوں کو  
 بھی مجبوراً انعام لینے کی غرض سے اس کے پیچھے دوڑنا پڑتا۔ شک کرو؟ ”نہو“ کہتا گھر کی طرف بھاگتے تھے تو ہم بھی کھتوں سے نکل کر  
 اس کا تعاقب کرتے گئے۔ لیکن گھر کے دروازے پر پہنچ کر ہم تنہا کا جوش یک لخت سرد پڑ جاتا اور ہم بلیر بول چکاے چپکے چپکے  
 اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتے۔ جہاں دادی پر دستہ رات گھر رہی ہوتی۔

ہامی اپنی کٹلی آنکھیں جھپک جھپک کر کہتی۔ ”بھئی! کتنے اچھے ہوتے ہیں دیہاتی! کتنے سیدھے ہیں ہاں میں ان میں۔“ اور  
 میں اور شوخا دکھلا دیتے گئے۔

شام ہونے سے پہلے ہم تنہاں میں سے کوئی اباں یا دادی سے گھر چھو کر وہ چار پیسے لے کر بازار میں چار پیسے کا ہواں کے برائے نام  
 بازار میں چلے جاتے۔ کٹلی کٹلی دیکھتی ہوئی چند دکانیں گھر میں کی نوٹیاں اور سٹے اونچے اونچے بے ہنگم چیتروں کی تو دھریں  
 بڑھاتے چپ چاپ کھڑی ہوئی دکانی دھنیں۔ اور چلم پیچے یا جسموں کی سبیل چراتے ہوئے وہ دکانداروں دکانی دھنیں جیسے انہیں نیند  
 آتی جا رہی ہو۔ میں تو ابھی سیدھی بھڑ بھڑنے کی دکان پر تکی۔ ہنسنے ہونے چکی کی کھیاں کے لئے وہاں گزے سونے سونے  
 سیواں اور پاول کی کھیاں پر ایک نظر اٹھتی اور پھر موٹاز کے سیواں گھٹتے گھٹتے چیتروں پر چڑھ کر دکان کی کسی نہ کسی چیز کو پھوڑتی۔  
 یاد دیکھ کر بھڑ بھڑنے کی پتلیاں مرنی ہوئی چنگاریوں کی طرح ایک لمبے کو چمک کر کچھ جاتیں۔ لیکن وہ مجھ سے کچھ بھی نہ دیکھتا نہ چھوٹ  
 کی چیزیں چھینتا وہاں کے لوگ تو جی جی بڑے سیدھے سے تھے۔ سیواں چڑھا کر وہاں دو دنوں یا تھوں میں دباے تھیں جلدی جلدی گھر کے  
 دروازے سے نکلتی۔ جہاں موٹا ہامی میرے شکر ہوتے اور وہ ادھر بھر سینہ دیکھتی ہی دیکھتے کڑکڑے لگے جاتے۔ میں اس

ری تھیں۔ بس بات بات پر ہم سب کو کوئی اور کوئی رشتہ۔ یہ تو خیر قریبی نہیں جیسے ایک دن تو مجھ پر آسان ٹوٹ پڑا۔ اس دن باپ سے میری جی جی تھی۔ اس لیے سب اور مرنے سوچا کہ باپ کو کھانے کے لیے گھر سے چلا جائے اور ہم دونوں بازار کی طرف چل پڑے۔ مرنو کو لا "آؤں اور دیر کے چلنا چاہیے دیکھیں یہ سڑک ایک قسم ہوتی ہے۔ اور ہم دھول اڑاتے آگے نکل گئے۔ کافی دور چلنے کے بعد ایک لہجہ بڑا اداس اور داناؤں پر نظر آیا۔ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ٹیخی گھوڑی ایشیاں جھڑے ہوئے پتھر میں سے دانت گوسے بڑی عجیب سی نظر آ رہی تھیں۔ جیسے دور دورا داناؤں کی حالت پر ہنس رہا ہو۔ ہم دونوں رک گئے اور مرنو اٹھا اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔

مرنو کو لا "اتھو کھانا اور داناؤں کو کس نے خورایا ہوگا؟"

"کسی راجہ نے خورایا ہوگا۔ نہیں تو اور کس کی ہمت ہے؟" میں نے بڑے دھڑک سے جواب دیا۔

"بھلا کس لیے خورایا ہوگا یہ؟"

"راجہ لوگ کوئی چیز بھرتے ہیں تو رعایا کو یہ دکھانے کے لیے کہ ہم انکی ایسی چیز میں بھی خیرا کیسے ہیں قوم لوگ کیا بخود آگے دیکھو جیسے تان چل ہے؟" میں شاید کوئی بڑا نیکو سائنس دان نہ تھا مگر پتا چلتی تھی۔

"دو دیکھو جھٹ میں" مرنو کی چیخ اچانک ماحول کی دیر دینی اور سنانے میں کوئی اور میں نے دیکھا کہ بہت سی چکاڑیں میرے سر کے بل چھٹ سے اس طرح لگی ہوئی تھیں جیسے ہمارے خاندان کی کچھ بھڑکی کے بھاری بھاری جانے بھول رہے ہوں بھڑکی اور بے بسی سے۔ مرنو مجھے دو پہلی شام یاد آگئی جب چکاڑوں کی آوازوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آخر یہ تپاں کہاں سے ہیں؟ میں انہیں اور قریب سے دیکھنے کے شوق میں دو ہزار سے قریب سڑک آئی۔

"ہے... ایچہ... رنے" دوسرے کراہنے کی آواز سنیں اور میں نے مڑ کر دیکھا تو دور دراز سے کچھ لوہی بنی ہوئی ایک سڑک۔ دوسری سرخ سرخ زینٹن پر دی ہوئی بھتیجی بڑی بڑیاں رگڑ رہی تھیں اور اس کے سینے پر سرخ گوشت کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔

"بھتیجی ابھاگ مورا" میں کھٹ بھاگی اور میرے پیچھے مرنو۔

ہم دونوں نے کھڑکی کر دی مرنو دیا۔ رات کو میں نے اور مرنو نے بڑی دیر تک باپ سے فطرسے سے نکل آنے پر پکے پکے باتیں کیں۔ اس وار سے کہ کہیں کسی اور نے سن لیا تو اب سے نکلتے ہوئی اور بھڑا باپ واقعی آج تک توڑی دی ہوئی جیسے کہ وہ کی بار بار جتا میں کہتے تھے۔

"بس چاہ اب ہم لوگ قطعی باپ نہیں لکھیں گے۔" مرنو نے افسردگی سے اٹھکھیاں پٹتا جے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں بہنوں نے

کچھ دل سے عید کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے۔ اب باپ نہیں لکھیں گی۔ کیونکہ اب میں بھوتی نے وہی طرح چکان لیا ہے۔

"اوا! باپ نے اپنی کٹلی آٹھیں پھیلا کر کہا۔" اگر بھوتی چاہے تو گھر میں بھی آ سکتی ہے۔ اسے روک ہی کون سکتا ہے؟" یہ سن کر میں تو بڑی فکر مند ہو گئی اور پھر اللہ میاں کا سہارا پکڑا۔ "اے اللہ میاں! اے میرے اللہ میاں! اگر اللہ میاں نے اب کے بھی مجھے محبت اور خوف کی دلدل سے باہر نکالنے کا کوئی انتظام نہ کیا بلکہ اس دلدل میں اور بھی دھنسا دیا۔

اس واقعے کے تیسرے دن بعد میں جی جی بہتر سے سر اٹھایا تو اسے بھوتی نظر آگئی۔ وہ باغ زمی کے قریب اپنے نئے ہوئے کو سینے سے دبوچے کھڑکی تھی۔ اب اس کا بیٹہ جھولنے کی طرح رانوں کو ٹک کر کیا تھا اور آٹھیں اندر سے میں کم ہوتی ہوئی خوشی کی طرح ہورہی تھیں۔ میں نے انتہائی خوفزدہ ہو کر دو بار دو چار میں منہ چھپا لیا اور مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت چھا گئی۔ جیسے میں آسان پر سے پھیل دی گئی ہوں۔

اچانک باور پئی خانے سے باورچن جھنگاڑی۔ نکل تو حرا کھادی "حیرا جاس ہو۔ میرے میرے جیسے پیٹ اس آگ لگ گئی۔

پاٹنی سے روٹی ٹانگ جی سارل پاچھ میرے پی جی جی ایت ہیں۔"

"ارہی چپ رہو جن! "اماں کی آواز میں بھتیجی تھی۔" کدرا اس سے کچھ پوچھنے دے۔"

"اسے لی لی کا پچھت ہوا سے یہ کچھ ٹھیک؟" میں تاسکت۔ اس کے دباکے تھیں۔" جن دن بزم کر لی اور مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ کھوج میں کی داغ بھی نہیں ہوتا۔

"کیاں ری چڑیل! اس بچے کا باپ کون ہے۔" اماں نے کریدہ شراغ کیا اور میں نے چاروں میں سے منہ نکال کر دیکھا کہ کہیں بھوتی اماں کو کھانے کے لیے نہیں بڑھ رہی۔

"ہم کا چانت ہے؟" بھوتی بڑبڑائی۔ "ہویم چکدر میں چکان۔ ہم کا گھٹ تھ۔" (ہم کو کیا معلوم؟ چکاڑیں ہوں گی بچا سون ہم کا گھٹ تھیں)۔

میرے دماغ میں جیسے ٹھک سے کوئی چیز لگی۔ اماں زور سے نہیں اور پھر ایک دم رنجیدہ ہو گئیں۔ انہوں نے بھوتی کی طرف بڑے نرم سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جن دن اسے روٹی دے کر باہر بھاگ دوڑ نہ گئے تھیں تو اسے دیکھ کر مانے کیا سوجھیں گے؟"

بھوتی روٹی لے کر اپنی لمبی لمبی آٹھیں اچھا لپٹا ہوا ہر ہاگ گئی۔

"ارے لی لی یہ بیشک دباکے پتلے ہے۔" بھیکیں برسیں بھیں۔ سال پاچھ ایک پی جی جن دیت ہے۔"

”جیتو محرومت“ ابائی سوچیں ہوتوں کی جنش سے محکمہ خیر طرحے پر قمر کیس۔ وہ اٹھے اور اماں کا ہاتھ بید روی سے پکڑ کر کچھٹے ہوئے کمرے میں لے گئے۔

”چکاؤڑوں کے بچے! چکاؤڑیں اندر جیرا ہوتے ہی چروں کی طرح ایک ہی طرف اڑتی چلی جاتی ہیں۔ اور بھوتی ایک دیر ان جگہ سرخ سرخ زمین پر لیٹ کر ایڑیاں رگڑتی ہے۔ پھر وہ سوتی اور بھوتی ہونے والے بچے کو دیتا دن دیناڑے ادا وہ بچے کھینچتے ہیں۔ اور پھر ادا خواہوا کو ادا اماں کا ہاتھ بید روی سے کچھٹے ہوئے کمرے میں لے جاتے ہیں۔ آخر کیاں؟ بھتی اٹھ پڑ گیا ہے؟ میں خوف اور محسوس کی ادھل میں سرنگ و محسوس مئی۔



”بچے کہاں ہیں سب؟“ اماں نے پوچھا۔

”نکھوتی گردن مروڑ دیت ہیں۔ ارے لپا لپا انش (مرد) کی جات ہوت ہے بڑی“ بھوتی نے بل کر ایک سڑی کی گالی پکی اور میں ابلجا کر اٹھ بیٹھی۔

”اماں... آں بھوتی آئی تھی... آں“ میں رونے کے قریب ہو رہی تھی۔

”بھوبہ! ام نہ بھتے تھرا“ اماں نے کچھ کر کہا۔ ”وہ بھاری تھیں کھائیں جانے کی۔“ اور میں صلت حیران ہوئی کہ آخر اماں کو بھوتی پر اس قدر رحم کیاں آنے لگا۔

شام کو میں اپنے بچک پر چٹ پڑی آسمان کو گھور رہی تھی۔ مغرب میں سورج سرخ چڑھا تھا اور ساتھ ہی بادلوں کے سلیڈ سلیڈ بہتے ہوئے نگوے افق کو چھوتے ہوئے سرخ ہوتے جا رہے تھے۔ آج مجھے چکاؤڑیں دیکھنے کا بڑا چاؤ تھا اور مگر کسی سے صوابدہ باقی نے وعدہ کیا تھا کہ آج شام کو انھیں بھوتی کے بچے کے ادا ایک کرسی پر خاموش بیٹھے اپنی مونچھوں میں مل دے دے جیسے ادا اماں میرے بائیں کچھٹے پر غمزدی رکھے ادا کو دیکھے جا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد چکاؤڑوں کی ایک قطار گردنیں تھماتی ’اپنے بچک ہاتھی کے کانوں کی طرح جھٹکی‘ مغرب کی طرف بڑھی اور میں بے ساراحتہ اپنی بچا بچا کر چلنے لگی۔

”وہ دو نکھوڑے چکاؤڑیں بھوتی کے بچکوں کے ادا کستے بہت سے ادا“

مواہرا اور بائی کی پٹکیں مارے حیرت کے پتھوں سے چٹ گئیں اور آ پانا آجل منہ میں غصوں کے مارے غصی کے کیمہ بھڑا پر جھٹ گئیں۔ ادا اپنی مونچھیں مروڑے مروڑے رک کر اماں کی طرف کڑی نظروں سے دیکھنے لگے۔

اماں بچے کے اندر میں پٹکیں۔ ”ارے آپ کھد کیوں رہے ہیں؟ وہ تو اس بچک کے لیے کھد رہی ہے جس کے حلق میں نے آپ کو دھپس میں بتا تھا۔ کچھ تو بچے چکاؤڑوں ہی کی ادا تھا تو ہے ڈار چک چروں کی بچا جاتی ادا د۔“

”کیا کہیں ہے؟“ ادا نے آہستہ سے انھیں ادا اماں کی آنکھوں کی چکاویاں کی جھڑکی محسوس ہو گئیں۔ میں ڈار بچک پر مسکت گئی۔

”ارے اچھ کہنے میں برائی کیا ہے؟ اماں نے بھی آنکھیں تریریں“ بھتی نے سوتی اور بھوتی کے ہونے والے بچوں کا تو پتہ نہیں لگا لیا ہے جو بچے کھد بچاؤں کا غضب ادا لے گئے۔

گول مول سر میں یہ بات کہہ کر سے کھس گئی کہ ہیکہ، مانگتا اچھا نہیں۔ فرض کیا کہ آکل لوگ بھانے ہیکہ دینے کے لئے جھڑک دیتے یا کوئی اور حرکت کرتے تو اس میں برائمانے کی کوئی بات تھی؟ جب پیشہ ہی ایسا علم اتوا تھی اونچی تاک لے کر چلے سے تاکہ۔ اور ہا جن کا۔ وہی جن بھکاری۔ اگر اس پر جان دیتا تھا تو اس میں گھر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ دو چار راتوں کو جب دیکھو اپنی سدا بہار بھاریوں سے بھر اہوا لہا سا جسم لہرا سدا دیتے ہوا جا رہا ہے۔

”اری دیکھ تا بھلی؟“ وہ گھٹکھا کر کہتا۔ ”اکیلی رات ہی ہے مگر پڑھتے ڈار نہیں لگتا۔ سالا سنا د کہرا ہے جو بھی کوئی آڑی بیڑی پڑ گئی تو میرے لہا کی رون گور میں گھلانے کی تو میرے ساتھ رہ۔ سر سالی میدان کو چپا سے بکڑ کر لال دون کا پتھر گرتے جواس نے بٹا ہوتا ہونے کے گور میں بھی تھوہے جواس میں چڑی چڑی کرنا کھلے آ کر۔ وہ میں ہم اکتھے ہیکہ مانگے لگتے کریں گے۔ پھر تو کوئی تھوہے فوہر بھر کر دیکھ جائے اللہ سم بھلی ایں آ نکھیں نکال لوں یوں“ اور یہ کہتے کہتے جن کا ہاتھ جس پر یہاں سے وہاں تک سرخ سرخ بھاریاں سلو سلو کے مانند پڑی پڑی تھیں۔ بڑھ کر تھوہے لکڑی ”آڑی بیڑی“ والا کچا بھلی کے چلے چھوٹ جاتے اور پھر وہ وی دل میں بڑا دن صبحیں کھاتی کہ ”اب جو گھر سے قدم نکالوں تو کوڑھی ہو جائیگا“ کہتے کھلے ہی سر جاؤں ہے دانہ پانی کھیں سر بند پڑے پڑے۔ ”اب بھلا کوئی سوچے کہ کم بخت بیٹھ جاتی جس کے گھر تو کیا برا تھا۔ نہیں تو کیا اسے کوئی دھکا دھکا یا جھانٹا جاتا برادری میں؟“ اس سے پہلے وہ دادا کے چپے سے کھاتی اور جن کو بھی کھاتی لیکن وہاں تو بڑی بڑی سوچ رہی تھی۔ وہ دن اپنے کھیں سر بند پڑی رات ہی۔ جن میں بھر میں جس دن پچیس سے ۱۲ اور ۱۲ خرواڑ پیند کر چلا جا۔ ایسی تو خوبصورت بھی تھی کم بخت اس دن راجھا تھی۔ کھلی ہوئی کلی کر گھر سے کی۔ اس پر یہ دماغ امن اچھا نہیں ہیکہ مانگتا اچھا نہیں۔ تو پھر اچھا کیا تھا؟ ۱۹ کو اس ایک دن من کے کان میں پڑی کہ بھلی کے چار دیوہ میں پیند اور کھانے کپڑے پر ایک کھاتے پیند گھرانے میں دن رات کی کوڑی کر لی ہے۔ بس غریب جن من پیند کر گیا۔ حسنا تھوہے کیا کدات بھر میں اس کے جسم کی ساری بھاریاں خون پیسے سے نکلیا گئیں۔ کر بھلی تو ایسی خوشی تھی کہ جیسے سارے جہان کی دولت مانگنی ہو۔ بات بات پر دوانت لگے پڑتے تھے اور زمین پر جیسے قدمی رکھی تھی۔ من سے لے کر شام تک کلبہ کے کل کی طرح کام میں لگی رات ہی۔ رات کو نہیں گیا وہ بے تک اپنے کھلے پر جانے کی لوہت آتی اور پھر صبح اذان کے وقت سے وہی دھندا۔ سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملتی۔ اس پر بھی کم بخت کی خوشی کا عالم کہ چلو دروڑا دکانے سے تو یہی اچھا ہے۔ اب گھر کی بیویوں کے علاوہ کسی کی کوڑی کھلی تھی نہ کوئی نہیں آتی اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اس کھلی دھندلے کے پونچوں سے وہاں بٹی محسوس سے گھر میں چلی آوں۔ اب جن کی محسوس کہ دھر بھاگ بھی لے۔“

کیمینی

شام کے پڑتے ہوئے اندر صبح میں

”کل صبح زادی اکل تو کیمینی بھاری اور کرا دی آ آوازوں کے ساتھ ساتھ شرم و حیا کے بوجھ سے دہلی ہوئی کیمینی آواز میں اس ایک بھلے کوادنے بچے سر میں رستے رستے بیا تک ہو گئیں۔ گھر کے اندر سے اس بھلے کے علاوہ دھک دھکا کا شور بھی اکلور ہا تھا۔ جیسے وہاں سب کے سب مل کر ہڑت ہوئی سردی کے استقبال کے لیے سونے سونے لافوں سے گرد بھار رہے ہوں۔ لیکن اصل بات یہ تھی۔ کیونکہ کوڑی ہی دیر بعد اندر جری ڈیڑھی کے پانوں پات کھلے ہوئے دروازے میں سے بچے کچے کپڑوں میں چلنا ہوا کوئی دم سے پٹی لگی میں آ گرا تو چاندی کی موٹی موٹی جھانکیں اور چڑیاں بڑی دلچسپ آواز میں بچا اٹھیں۔ بھلا اس کے جسے سوانے بھلی کے کس کے بڑیا یوں بھلی کی بچا بچا کھتے ہیں؟

دھواک دھواک کر کے کھلے دروازے کے درلوں پت بچھ گئے۔ بلی میں اور وہ یہ مکاؤں کے کچھ دروازے کھلے۔ چھوٹے بڑے چھوٹے بھانگے آ نکھوں میں غارت آ میر بھرو دلی بھلی اور پھر بھکھیں۔

اچھا ہوا اپنی اوقات بھول گئی تھی کیمینی۔ بڑی آئی تھی کیمینی کی بھکھیں کر گھر میں برا بھونے۔ پر یہ نہیں جانتی تھی کہ بھکھیں پیدا ہوتی ہیں بنا نہیں کر تھیں۔ اور یہ پیدا بھی ہوتی ہیں تو صرف اونچے گھرانوں میں۔ مطلب یہ کہ جو ذات پات میں اونچے ہوں اور جن کے ہاں چاندی کے کتے چپکے کھتے ہیں۔ یہ نہیں کدات کے کتے تو غیر نہیں اندھیاں نے دھروں کے کتے ہا تھ بھلائے کدو چائیں اتارنا ہو وہاں بیکسین پیدا ہونے لگیں۔ ابھی چند سال پہلے کی تو بات ہے کہ انٹیں گھیں میں بھلی بھلی کر سے۔ ”اللہ بھلا کرے“ کی روٹی کھاتی تھی۔ پادانے اس ایک صدا پر اتار پڑا کر سرتے وقت جیسے کے قبرستان کے قریب اپنی زہین چھوڑی اور اس پر کھلی ہوئی مکی چھار دیواری۔ بھلا کوئی اچھا نے اپنی اسے تو اس زمانے میں تمام مکر مکر کی جانے کے بعد اپنی قبر بھانے کے لیے دو گز زمین خرچہ چھوڑے؟ مگر جب کسی کی شامت آ؟ ہوتی ہے تو صبح پر پھر پڑ جاتے ہیں۔ یہی ہوا بھلی کے ساتھ کہ باڑی آ کھ بند ہوتے ہی ”بھلی“ سے ”بڑی“ بننے کا خبط ہو گیا۔ وہی بات کہ جب چینی کی موت آتی ہے تو اس کے پر بھلے آتے ہیں۔ نہ جانے کم بخت کے

چند مہینے تو وہ اسی غوثی کے گھر میں بچس کر خود کو بھی بھولی لیکن پھر ایک گھنٹی بوجھ میں جہنم نے اسے خطرناک طریقے پر ستا شروع کر دیا۔ جب وہ بیکہ لگا کر قہقہے لگتی تو ”اللہ بھلا کرے گا ایک روٹی یا ایک پیڑل جائے“ کی صدا لگاتے ہی آنسو گھروں سے اور چڑ بھی لانا لگے یہاں کا یا کرتی تھی۔ وہ چڑ جس سے کبھی تو وہ غارت کرتی اور کبھی صحت۔ سناں گلیوں کی گھٹنوں میں لیٹے بیٹے پاتے شوق فرماتے ہوئے کوئی بزرگوار اسے دیکھ کر مارے شقت کے کچکا کر اپنی ایک آنکھ بچنے کا منتہا تبسم سے اپنی بانٹیں لوازتے پاس کی آغوش پر چڑھ کر کھتے ہوئے اس کے گول مول ہاتھ کو ہلا دیتے تو اسے ایسا لگتا جیسے کہ اس کے گھوڑوں کے نیچے آتش بازی کے دو اندر کھٹے چھوٹ رہے ہیں۔ سرور سرور اور چنگاریاں ہیں کہ سیدھی دماغ میں جا کر بکھر رہی ہیں۔ اس موقع پر اس کا پیچھا کر دود چار لگی لگی گالیاں دے کر لپکا ہوا ایک تباہ کر اس طرح مارے کہ بچی کوئی آنکھ کا دھو نہ خون ہو کر بہ جائے اور پھر ان کی ایک آنکھ ہمیشہ کے لیے کچ جائے۔ حرا آجائے جو مہاں کی اپنی بچی ہوئی آنکھ کی وجہ سے اپنی بہنوں اور بھتیجیوں کے لیے بھی ایک برسا اشارہ بن کر رہ جائیں۔ لیکن وہ کہہ کر نہ پاتی۔ اسے اپنے پیٹے سے غارت کرنے کے۔ پھر اس کے جب کی گھر سے اس کی صدا کوئی لڑکا نکل کر بچی آنکھیں دکھا دے تو کھنگلی کر ابا محسوس ہوتا کہ سر میں ایک مٹھی مٹھی گھمری جاگتی ہے۔ لپکا لپکا ہوا ہو گیا ہے اور انکس ہیں کہ مظلوم ہوئی جا رہی ہیں۔ اس کی چاہتا کہ دھڑا سے زمین پر گر پڑے اور آنکھیں بند کر کے اس گھمری کے حوسے لیے جائے۔ پرفوت یہاں تک پہنچتی ہی نہ پاتی۔ کیونکہ ایک آنکھ بچنے والے بزرگوار اپنی دوسری کھل ہوئی آنکھ سے اپنے پاں بچوں اور اڑوں پاؤں والوں کی نگرانی کرتے ہیں۔

”اور فیصلہ... دوسرا دروازہ کچھ“ کسی نہ کسی طرف سے یہ پتلا کھلم آلود جھٹکتی ہوئی آواز میں اس طرح چلتی کہ اس کی گھمری تو ہوا ہو جاتی لیکن شہر بھٹک اٹتا۔

”کیا برا ہو رہا ہے“ وہ بڑی غارت سے اپنے پیچھے کو جھنک کر گالیاں دیتی۔ یہاں تک کہ اس نے نوکری بھی کر لی اس کا رن گھر اب بھرا کھٹنڈ ہے۔

”چاہے کچھ ہو جائے اب بیکہ مانگتے سے تو رہی۔ دوسرے دھن بھرا بچپا بکڑے گا۔“

وہ بہت دیر لپکتے کے ہاں بڑا پیش کیا فیصلہ چٹکے سے صادر کر دیا کرتی لیکن یہ شیطانی خواہشیں تو بس بالکل سیدھا لانا کا ہائی ہوا ہوتی ہیں۔ وہی ہمارا جس کے چہرے میں دانگے کی لگی چٹکی ہوتی ہے اور جسے خدای نے اپنے لٹانے کی آنکھ کو کش کرتے ہیں مگر وہ بہت قلعہ جاتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ اس کی تو بہت ہی ایسی ہوتی ہے۔ پھر کھنگلی کی تو یہ حالت تھی کہ بیٹھا بیٹھا ہاپ کڑوا کر واٹھو۔ بیکہ اٹکتا

برا جہنم برا آنکھ بچنے والے برے۔ نوکری کرنا اچھا گھر میں وضعا اچھا۔ اب ایک اور ایسی اچھاٹی کی چاہت ہوئی جو جہنم کی برائی کے مقابلے پر غم فطرت کر جائے لیکن اس کے لیے تو چار چار دن لڑنا چاہیے کہ کچھ چند مہینا جائے اچھا بھلا اور یہاں چھائی تھی ستوا لٹی ہوئی دلی جس کے سامنے میں بچپن کے کئی گھر سے کھلا اور سونے موئے مہاسوں کے نیچے گھر سے سب برائیاں بھی دب جایا کرتی ہیں، وہاں سے بھنگی بھنگی گلی گلی گھومتے والی دنیا کو دیکھ کر بہت تازہ بھٹی تھی۔ بس اب گھر کے کام کاج کے مقابلے میں اپنی بھی گھر پر تھی۔ تو خواہروں کٹھن کرنے کا ہوش نہ تھا۔ سوتی موٹی جیسے سارے سر میں بلہائی بکھریں اور پھولی چھولی ابھی ہوئی نہیں جو سونے دوپٹے کے ذرا ادھر ادھر ہونے سے کانوں کے پیچھے سے ہوں جھانکتی جیسے موئے موئے چہرے چاہنے والوں سے نکلنے کا موقع تاک رہے ہوں۔ اب وہی نہیں چلوں سرسوں کے تیل سے بھگو کر دن میں دو پار چوٹی میں بکڑی جاتی تھیں۔ پکڑے جن میں پیچھے ہور سانسوں کی ہوا اس طرح بھی رہتی کہ دوری سے اچھے بھٹے دماغ اڑنے لگتے تھیں اب وہی بعد جمعوں کے نیچے ٹیوں مسابن سے صاف کئے جاتے اور پھر چوڑی دار چاہا سے کو پڑھ لیں پرکس کے ساتھ دیکھتی کھنگلی ہوئی پڑھ لیں کا گوشت جیسے ہوئی ہوئی ہو کر اہل پڑتا۔ مائیں کہہ جھانپتا تو باتوں ہی باتوں میں لپکتی لپکتی کے۔ کیونکہ انہیں اپنے بڑے میاں کے جھپٹے لیے جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن کھنگلی نے نہایت بھولے پن سے اللہ رسول کی قسمیں کھا کر ان کے دل کا سارا تیل دھو دیا اور بھٹی رہی اپنے رخ پر گھر کے مردوں میں سے جہاں کسی کی نظر باور اپنی خانے کی طرف اٹھی تو بس کھنگلی کی رگ رگ میں ٹپکی جاتی۔ ٹپکی جاتی نہ پاتی۔ اگر ہڈیاں بھونکی ہوتی تو چھپا سستے زور سے چلائی کہ ہاتھ کی ہے تھا حرکت کرتے سے وہ پند غریب ہم کھٹے سے لپکتا۔ کوئی چیز اٹھانے دھرنے اٹھتی تو پتہ ہم کھنگلی کو دیکھنے والے کا دل دھونڈنے میں بھی لٹا۔ یا کچھ کھنکھناتی ہوئی مرنے کو بکھانے کے بہانے فخر سے چست کرتے لپکتی۔ اور کبھی گھر کے کتے نالی سے باتوں ہی باتوں میں چنے کی باتیں کہتے لپکتی۔ بس ہاں ہی خانہ کیا تھا کسی تالاب کا کاروبار جس پر کھنگلی اپنی اور فیصلہ سنبھالے کھنگلی کا کھار کھیل رہی تھی۔ اپنے کانٹے میں جیروا کا چارہ چھنڈا۔ کئی ہوشیار چھپایاں لپکتیں کہ لاؤ چارہ وہ صفائی سے اڑا جائیں۔ لیکن کھنگلی بھی کبھی کوئی نہیں کھیل رہی تھی۔ اسے اس کی سوتی چل چل چھی چھی چارہ کھانے کے بعد اس کی پیچھے کہ وہ ان مہراں کا گوشت نوح نوح کر بیٹھ بھرتی رہے تو پھنسی ایک بیوقوف کھنگلی اس کے کانٹے میں۔ معراج میاں۔ صاحب خانہ کے بھانجے تک تک سے اور سوت۔ لیکن حرات کے کڑے اور پرے اور بچے کے خدای اور کال۔ انہی بیویوں کی وجہ سے وہ سارے کتے میں بدنام تھے۔ لوگ اپنی لڑکیاں ان سے بچا جانے کے کام کو ان پر ہاتھ رکھتے کہ نہ لپکا اپنی کوٹھ یا کوٹھن تھوڑی تھوڑا ہے جو سراج کو بچا دیں۔ ”گھر میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں تھی دیکھو ان سے کھنگلی رہتا۔ لیکن

وہ تھے کہ سارے گھر کو جوتی کی ٹوک پر رکھنے اور پی خانے کے سامنے والے دالان میں چار پائی پر اوپر سے پڑے انجیس بایا کرتے۔ یا پھر دوپٹے روز پر کرانے کی لائی ہوں تاہیں پڑھا کرتے لیکن جب پہلے ٹوڑی نہ ہونے کی وجہ سے انہیں نہ نکلتے اور نہ سگریٹ کی طرح سے تو توڑی بہت بھائیوں اور انگریزائیاں لینے کے بعد ان پر غور واری کا دورہ پڑ جاتا کہ جب تک وہ خود نہیں گے غریب میں بھی نہ ہائوں گا۔ یہ فیصلہ کر کے ان کی طبیعت ایسی موزوں ہوتی کہ مریضوں کو بچاؤ اور نوزوں کو بھاجا کر طبیعتی مٹھی گالیاں دیتے تھے۔ بس خاص طور سے سہرہ ہری جی کہ بھنگی نے بچاؤ دیا۔ معراجیوں کے لیے بھنگی سب کی نظر بچا رہا گوشت اور بھی میں تر دیاں کیا کرتے تھے اور دقت بہت اپنی تھوڑی میں سے وہ پیر دو پیر سے سگریٹ پان کے طرف کے لیے ان کی جیب میں کیا ڈالتے تھے کہ اس روای کے اور ہے۔ بالکل اس مٹھی کو بھی کی طرح جس میں کوئی تندی چڑی اور دوا ہا۔

ایک دیر کو بھنگی نے ہانگن سے اپنے گھر کی دیکھ بھال کے لیے بھنگی کی اور بھنگی بنی۔ اس کے بعد معراجیوں کا دل گھر میں کیسے لگا؟ اس جلی ہوئی شہر دانی مینی ہاؤس میں تھل ۱۹۱۱ اور اپنے ایک دوست سے ملے چلے گئے۔ شام کو جب وہ دونوں لوٹ کر آئے تو خوب مقررہ چائے اور کسی سستی سی خوشبو میں بیٹے ہوئے۔

"بڑی" ہانگن منہ بچا کر نہ صرف اتنا ہی پیٹے کہ نہیں۔ لیکن دوسری صبح ہانگن نے رات بھنگی کے کھنوں سے غائب ہونے پر جو باز پرس کی تو معراجیوں نے ان کے کی چوٹ پر سلطان کیا کہ "انہوں نے نکل بھنگی سے نکاح کر لیا ہے" ایک لمبے کے لیے جیسے سارا گھر محرقہ دق ہو گیا۔ تو بھلا اتنا بھی عیدہ ہین کیا؟ انا کہ کہنے کی انہیں فیصلہ رسی تو اس کا یہ مطلب توڑی تھا کہ کتنی کوسر چاڑھ لیتے؟ ابھر اور اگر انہی کی کوئی بھوری تھی تو یہی کام چلا لیتے "نکاح کی کیا ضرورت تھی؟ اب جو گھر والے بکڑے اور زرا بھنگی کے ہال کچڑ کر دیں پانچ ہاتھ مار دے تو معراجیوں وہی معراجیوں جہاں اپنے باپ کے مرنے کے بعد سے ماموں کی رونیاں توڑ رہے تھے محتاطہ پر آگئے۔ بڑے ماموں کو انکی لاشوں کا طعنے دیا اور کہنے بھری دھکی بھکی بھولنے پر اتر آئے۔ ان کی شان کا ایک جھک بھنگی کی کا طریقہ ایسا ہا کہ کہہ سکتے ہوگی تھن کا میں۔ یوں آگ کا تانے کے بعد بھنگی کو نے کراہی گئی کہ ایک چھوٹے سے مکان میں بس گئے۔ کہنے والے ایسے شخص کو نہ کیا تھے۔ جس پر صورت کی جراتی کا ہار دیا گیا ہو۔ اس موت و زندگی کے لیے انہیں چھوڑ دینے کا مہم کر کے چھوڑ دے۔

اب وہی معراجیوں تھے کہ جنہیں پڑے پڑے روٹی کمانے کا پکا تھا "کمانے کی فکر کرنے گئے۔ ڈگری تو خیر دھڑلے نہ ملی کیونکہ وہاں کی مہربانی سے انہوں نے کوئی ڈگری تو لی نہ تھی۔ بھلا کوئی معمولی پڑھے لکھے سے غلامی کیوں کر دالے گا؟ اب انہوں نے

بھنگی کے کھانے پڑھانے سے واقف کتنی کھول لی۔ اس کے لیے بھنگی نے اپنا گھر کھلی کر دیا۔ یہاں کے ہاتھ پر رکھ دیا اور رفاقت بنانے کے بارے ایک سال تک ٹھہریں میں کپڑے گھر کے محل سے دھوتی رہی۔ یہاں تک کہ کا خوب چمک اٹھا۔ اب بھنگی کے پاس بارہ نوے تھی جو کبھی لٹے لگاتے بیکہ کا کرتی تھی۔ اب گھر میں سین مل کی ساریاں پانچہ کر کھوتی۔ چاہے کم بخت کو ساری ہانہ سے کی تیز نہ ہو۔ شخصوں سے ہاٹ بھرا ہوئی۔ سامنے سے دیکھو تو ایسا معلوم ہو کہ کس ایک بچے کی صورت میں معراجیوں کے گھر سے خاندان پر کلک کا ٹیکہ کر رہی۔ گھر واپس بھنگی تھیں۔ اب یہی کہہ رہی تھی بھلا توڑی جانی کا۔ موٹی موٹی بھانجیاں لگے ہیں میرا کچھن دار اور کچا کچا میرا بھر کر ہے چڑیاں۔ گھر میں جب اتر کر بھنگی تو سارا ملامت بھانجیوں کی جہن جہن سے گویا۔ کبھی تو معراجیوں کی طبیعت پر تھوڑی تھوڑی کرتے کہ جانے کیسے اسے جانی کی حیثیت سے برداشت کرتے ہیں میرا معراجیوں تو مارے غوطے کے اپنے تے پھر تے کہ بھنگی جیسی عورت کے نصیب ہوگی؟ وہی چڑیاں لکھاں کی کس نے کھوڑے پر دانہ چھتے چھتے ایک ٹوٹا ہوا جھوتا موٹی پالیا۔ بس چوٹی میں دبا کر راجہ کے محل کے گلے پر چھڑ کر کہنے لگی "میرے پاس دو راجہ کے پاس لکھاں" تو بھلا بھنگی میں رکھا ہی کیا تھا؟ "میاں کی خدمت کرنا چاہا ہوں تو دن رات ایک کر رہا تھا گئے تک روزانہ پاؤں دبا کر کھانا کھا کپڑے سے سینا اور دکان کے کام میں بھی زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹاتا یا میاں کے بے پناہ غصے کی جھٹ میں آ کر دوسرے تیسرے دن پٹ لٹا اور منہ سے اٹھ نہ کرنا۔ کبھی تو سب ایک حال تھا جس میں اس نے معراجیوں کو بری طرح چھاس رکھا تھا۔ بس یہی بات تو معراجیوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی یا پتی تو ہر شخص اسی طرح میں سمجھ رہا تھا اور اس لیے کہتا۔ لاکھ کہنے براہری کے لوگ انہیں چھوڑ چکے تھے لیکن آخر اپنے خون کے جوش کو کیسے دباتے کہ معراجیوں کے کاروبار کا سارا رطل اپنے خاندان کی کسی لڑائی پر صرف ہونے کے بجائے بھنگی کے تنگ نگہ ہاتھ۔ ایک رات میں عورت کے۔ جس نے خود کو تانے کے لیے ایک بٹاتا یا خاندان کا زخما۔

ایک دن معراجیوں کی حالت زرا کہ گھر میں تہہ دار ہوا تو معراجی کے ماموں کا دل بھرا یا اور پھر اس وقت تک میرا راجہ تک کہ کہ گئے اٹھارہ لینے کے بعد معراجیوں کی صورت نہ دکھائی دے گئی۔ بس پڑھے اور انہیں کیلیے سے لگا لیا۔ کیسے احمد وہاں یہ اگلے وقت کے لوگ۔ کہنے لگے۔

"میاں کچھ ہونوں کی محبت مارے نہیں مرنی اپنے جسم کا کوئی حصہ سزا جائے تو اسے کاٹ کے توڑی پھینکا جاتا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا خیر تم نے تو کیا کیا؟ یہ سب میرا درخام غور بھنگی کے گلشن ہیں اور تم تو خامس ہوئے بھالے تھے پڑے" مارے رات کے ان کی تقریر احموری رہ گئی اور معراجیوں کے بھی آنسو ٹپک آئے۔ عرصے تک خاندان سے الگ رہ کر بڑی کی سی محسوس کر رہے



کے دو چار سر ڈھانچوں کی شان سے۔

”اگلے تو حرام زادی اگلے تو سبکی“

دھواک دھواک کر کے دروازے کے دونوں پٹ بجھ گئے۔

شام کے بجٹے سے اندھ جھرے کورات کی گہری تاریکی اگلے بجلی گئی۔ اور گلی کی لمبی پلاز زمین پر چمکی نالی میں سرازالے پے س و

حرکت پڑی گئی۔ دروازے اس کا جسم پھوڑا اور ہاتھ اس میں بیٹھی بیٹھی گھمری گئی اور دونوں پر لگی لگی کالیاں۔

دھت! اکسیتی!

